قومی زبان

قلی قطب شاہ بہادر شاہ ظفر ولی دکنی
ڈپٹی نذیر احمد مولانا شبلی نعمانی
مولوی وحید الدین سلیم بابائے اردو مولوی
سید احمد دہلوی مولوی عبدالحلیم شرر مرزا ہادی رسوا
مولانا حسرت موہانی ظفر عمر بی اے نیاز فتحپوری
ممتاز شیریں اثر لکھنوی عزیز لکھنوی محمد حسین آزاد
میر تقی میر خواجہ میر درد
مومن خان مومن رشید احمد صدیقی فرحت اللہ بیگ دہلوی
جوش ملیح آبادی آغا شاعر دہلوی شاد عظیم آبادی
سیماب اکبر آبادی علامہ اقبال مولانا ابوالکلام آزاد مولوی عبدالحق
مولانا عبدالماجد دریا آبادی رجب علی بیگ سرور فانی بدایونی
غلام السیدین نواب سراج الدین سائل دہلوی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
آغا حشر کاشمیری قاضی عبدالودود یاس یگانہ چنگیزی
مولانا اسلم جیراجپوری وقار عظیم ساغر نظامی
سہیل عظیم آبادی

نومبر ۱۹۸۲ء

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

ماہنامہ
قومی زبان
کراچی

نومبر ۱۹۸۴ء
جلد ۵۴
شمارہ ۱۱

مضمون نما

اداریہ		۳
گراماتِ سلیمان	پروفیسر سید فخر الحسن	۵
اقبال ایک تنقیدی جائزہ	پروفیسر محمد رفیع عالم	۱۱
غیر افسانوی طرزِ تحریر	پروفیسر یونس شرر	۱۹
مرزا ظفر الحسن	آمنہ مشفق	۲۷
ڈاکٹر محمد ایوب قادری	محمد محی الدین بدایونی	۳۱
غلام عباس۔ ایک مطالعہ	شفیق احمد شفیق	۳۷
غزل نما (حسرت عظیم آبادی)	ادا جعفری	۴۳
گوشۂ طلبہ		
تخلیقی فکر	پروفیسر طاہر نقوی	۴۹
میگنا کارٹا	عبد النعیم قریشی	۵۲
گلہائے رنگ رنگ		
ناگن کا انتقام (بنگلہ)	تاراشنکر بندوپدھیائے	۵۷
خوشبو (سندھی)	تنویر عباسی	۶۳
گرد و پیش	نمائندے	۶۵
پیش رفت	مراسلہ نگار	۶۹
رفتارِ ادب	مبصرین	۷۳
حروفِ تازہ	ادارہ	۷۹
ردِ عمل	قارئین	۸۳
نئے خزانے	ابو سلمان شاہ جہاں پوری	۸۷

ادارۂ تحریر
جمیل الدین عالی
ادا جعفری
شبیر علی کاظمی
معاون
علی حیدر ملک

قیمت ..... ۵ روپے

بدلِ اشتراک
فی پرچہ .... ۵ روپے
سالانہ .... ۵۰ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ..... ۱۰۰ روپے

بیرونِ ملک
فی پرچہ .... ۱۰ روپے
سالانہ .... ۱۱۵ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ..... ۱۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱، فون: ۲۱۷۱۳۷

اداریہ

نومبر ۱۹۸۴ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔

یہ مہینہ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی پیدائش کا مہینہ ہے اور اس لحاظ سے ہمارے لیے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ حضرت علامہ اسی ماہ کی نو تاریخ کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ نہ صرف اُردو زبان و ادب کو وسعت دی اور اسے فکر کی نئی بلندیوں تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ہی انھوں نے قوموں کے حق خود ارادی اور عالمِ اسلام کی نشاۃ الثانیہ کا پیغام بھی دیا ـــــ علامہ مرحوم کی شخصیت، ان کی زندگی اور فکر و فن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا ـــــ ہم اس شمارے میں ان کی شاعری پر پروفیسر محمد رفیع عالم کا ایک مضمون پیش کر رہے ہیں جس میں علامہ کے فن پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے ـــــ اسے حضرت علامہ کے حضور ایک خراجِ عقیدت بھی کہا جاسکتا ہے۔

علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے علاوہ اس ماہ میں اُردو زبان و ادب کے کئی محسنوں اور نامور اہلِ قلم کی برسیاں بھی ہیں جن میں علامہ سید سلیمان ندویؒ، غلام عباس اور ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے نام شامل ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی حیثیت ایک جید عالم اور بیسویں صدی میں عالمِ اسلام کے ایک بطلِ جلیل کی تھی۔ انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کے مشن کو جس طرح آگے بڑھایا وہ انھیں کا حصہ تھا۔ پروفیسر سید فخر الحسن نے سید صاحب مرحوم کی زندگی کے روحانی پہلو کو اپنا موضوع بنایا ہے جسے ہم اس شمارے میں شامل کر رہے ہیں۔

اُردو کالج (جسے انجمن نے قائم کیا تھا اور جو اب وفاقی حکومت کی تحویل میں روز افزوں ترقی کر رہا ہے) کے معروف استاد اور محقق ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم کے بارے میں محمد محی الدین بدایونی صاحب نے ایک مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ اسی طرح نوجوان شاعر اور مضمون نگار شفیق احمد شفیقی نے اُردو کے بلند پایہ افسانہ نگار غلام عباس مرحوم کے فن کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ غالب لائبریری کراچی کے بانی و مہتم اور متعدد کتابوں کے مصنف و مولف مرزا ظفر الحسن مرحوم سے متعلق محترمہ آمنہ مشفق کا ایک مضمون بھی شریکِ اشاعت ہے جس میں انھوں نے مرزا صاحب کی شخصیت اور خدمات کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔

اس شمارے کا ایک خاص مضمون "غیر افسانوی ادب ـــ افادیت و اہمیت" ہے۔ اس موضوع پر مغرب خصوصاً امریکہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ پروفیسر محمد یونس شرر نے ایک نئے اور اس عہد کے ایک اہم موضوع پر پہلی بار طبع آزمائی کی ہے ـــــ عالمی

ادب کے تناظر میں غیر افسانوی ادب اور غیر افسانوی افسانوی ادب خصوصی اہمیت کا حامل ہے ـــــ یہ موضوع وسیع بھی ہے اور پہلو دار بھی ـــــ ہم پروفیسر یونس شرر سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اس موضوع سے متعلق دیگر مسائل و مباحث پر بھی اظہار خیال کریں گے ـــــ دوسرے حضرات بھی اگر اس سلسلے میں اظہار خیال کرنا چاہیں تو "قومی زبان" کے صفحات حاضر ہیں۔

"قومی زبان" کے دیگر مستقل عنوانات حسب سابق زیر نظر شمارے میں بھی موجود ہیں ـــــ ہمیں اس شمارے کے مندرجات سے متعلق آپ کے تاثرات کا انتظار رہے گا ـــــ آپ ہمیں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں تاکہ ہم اس کی روشنی میں "قومی زبان" کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔ (ع۔ ح۔ م)

اعتذار:

"قومی زبان" کے گزشتہ شمارے میں صفحہ ۴ پر چوتھی سطر میں ایک عبارت اس طرح شائع ہوئی ہے۔ "شیخ الجامعہ حضرات علم و تحقیق کے درخشاں ستارے ہیں لیکن وہ سرکاری ملازم بھی ہیں اور وہ بھی ۲۱ گریڈ کے ...." یہاں کتابت کی غلطی سے ۲۲ کے بجائے ۲۱ گریڈ چھپ گیا ہے۔ سرکاری ملازمت میں ـــــ گریڈ ۲۲ کا حامل حکومت پاکستان کے سیکریٹری کے مساوی ہے۔ میں ذاتی طور پر تمام شیخ الجامعہ حضرات سے اس سہو کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ ـــــ نور الحسن جعفری

اردو کے عظیم افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کا ۱۱ نومبر کو بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ ۲۰ نومبر کو لاہور میں بے مثل شاعر فیض احمد فیض بھی انتقال کر گئے۔

کراماتِ سلیمان

پروفیسر سید فخر الحسن

علامہ سید سلیمان ندوی نے جب علم و فضل کی بلند ترین چوٹیوں کو سر کرنے اور افغانستان، ایران، عرب و ہند میں اپنا لوہا منوانے کے بعد تھانہ بھون سے اپنا رشتہ استوار کیا تو علماء انگشت بدنداں رہ گئے اور فضلائے ندوہ تو جیسے سکتے ہی میں آگئے۔ فاضلانِ ندوۃ العلوم کو یہ دکھ تھا کہ چمنستان ندوہ کا گل سرسبد دفعتہً تھانہ کیوں کر پہنچ گیا۔ اگر علمائے مذکور کی حیات سلیمانی کے عرفانی پہلو پر نظر ہوتی تو یقیناً حیرت اور استعجاب نہ ہوتا۔ چونکہ جیسا کہ عموماً ابتداً تصور کیا جاتا تھا علامہ دفعتہً مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید ہو گئے یا علامہ با ایں ہمہ علم و فضل سلاسل تصوف کے اسیر ہو گئے اس نظریہ کو علامہ صاحب نے باطل قرار دیا۔ اور اپنے روحانی سفر کی داستان قلم بند کر دی جس سے اس اشکال کا خاتمہ ہو گیا۔

دراصل علامہ جس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اس پر تخم معرفت کی گل کاریاں جابجا نظر آتی ہیں۔ حضرت علامہ کے والد بزرگوار حکیم سید ابو الحسن صاحب نہ صرف حاذق طبیب تھے بلکہ نقشبندی ابو العلائی سلسلہ کے شیخ اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ حضرت علامہ کے عم محترم حافظ تجمل حسین ایک صاحب حال بزرگ اور شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے خلیفہ تھے۔ حضرت علامہ کے برادرِ بزرگ سید ابو حبیب صاحب جنہوں نے سید صاحب کی روحانی تربیت کی وہ مشہور جید عالم اور ابو احمد بھوپالی مجددی کے خلیفہ مجاز تھے۔ مولانا نے دیہاتی خواتین کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تصنیف تقویت الایمان سید صاحب سے عورتوں میں پڑھواتے اور خود پس پردہ اس کی وضاحت فرماتے تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے تھے وہ (مولانا ابو حبیب صاحب) جو فرماتے تھے دل میں بیٹھتا جاتا تھا۔[1]

"یہ (تقویت الایمان) پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں اور کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ اور معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی و ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے مگر اسمٰعیل شہیدؒ کی تلقین بہرحال اپنی جگہ قائم رہی۔"

علاوہ ازیں اسی دور میں اپنے بڑے بھائی حکیم ابو حبیب صاحب کے حسب ہدایت کچھ ذکر اور مراقبات بھی کیے۔[2] اور ان کے حلقۂ توجہ میں بیٹھے۔ علامہ موصوف نے فرمایا کہ "ان کے فیض سے اپنے اندر پاکی محسوس کرتا تھا۔"[3] گویا زمین تیار تھی۔ تخم ریزی ہو چکی تھی

۱؎ ڈاکٹر غلام محمد: تذکرہ سلیمان: ادارہ مجلس علمی سنہ ۱۹۶۰ء ص ۳۵ ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن: معارف سلیمان نمبر سنہ ۱۹۵۵ء ص ۲۰۱، ۲۰۲

کلہ بھی پھوٹ چکا تھا۔ اور اندر ہی اندر جڑیں پکڑ رہا تھا۔ یہ دراصل علامہ کی کرامت تھی کہ انہوں نے اسے مخفی رکھا۔ تصوف میں اول تا آخر ہر منزل پر اس امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ مرشد کا ایک اہم کام اس سبق کو ذہن نشین کرانا اور مسترشد کا اہم فریضہ اس کو ازبر کرنا ہوتا ہے اور سالک سے اس باب میں جب بھی ذرا چوک ہوتی ہے وہ اپنے مقام سے برسوں نہیں تو مہینوں پیچھے جا پڑتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم" کا مصداق ہو جاتا ہے۔ علامہ کی اس کرامت کی تو خلافت کیا بیعت سے برسوں پہلے تصدیق ہوتی ہے۔ اسی لئے خرقہ خلافت کے عطیہ پر جب غوغا ہوا تو مولانا تھانوی نے معترضین کو جو جواب دیا تھا اس سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے۔ مولانا تھانوی نے فرمایا تھا:۔

"تم لوگ گیلی لکڑی کی طرح ہو زمانے تک ساتھ رہنے کے باوجود تم میں وہ کیفیت نہیں پاتا جو سلیمان ندوی میں پاتا ہوں۔ وہ ایک خشک لکڑی کی مانند ہیں اسی لئے میری نظر ان کی طرف گئی"

اسی بات کو مولانا ابوالحسن ندوی صاحب نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:۔

"چونکہ عراقی کی طرح ان کا باطن اس حرارت و حلاوت کے لئے بالکل تیار نہ تھا اس لئے انہوں نے سالوں کی راہ مہینوں میں، مہینوں کی راہ ہفتوں اور دنوں میں طے کی اور شیخ وقت کے اعتماد و استناد سے بہت جلد سرفراز اور ان کے خلیفہ مجاز ہوئے"

یہاں یہ اشتباہ ہو سکتا ہے کہ بیعت کے بعد شیخ کی نگاہ گرم نے لکڑی کو خشک کر دیا ہو۔ لیکن چند واقعات سے حقیقت حال پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک تو مجدد الف ثانی سے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی برزخی ملاقات کا واقعہ جو ڈاکٹر غلام محمد صاحب مصنف تذکرہ سلیمان نے تفصیل سے لکھا ہے[1]۔ دوسرا واقعہ واپسی سفر افغانستان پر ملتان میں شیخ بہاء الدین ذکریا سہروردی ملتانی کے مرقد پر پیش آیا۔ علامہ سفرنامہ افغانستان میں رقمطراز ہیں[2]:۔

"میں سیدھے حضرت کے مزار پر گیا، دعا مسنونہ پڑھی، مقبرہ کے اندر خاصی تاریکی تھی۔ تاہم آنکھیں بند کرتے ہی ایک نور سا چمک گیا۔ سہروردی سلسلے کا سرتاج یہاں محو استراحت ہے۔ سبب نہیں جانتا، تاہم دل نے ایک اثر محسوس کیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھلک گئے"

علامہ نے خانقاہ بہاء الحق کے متعلق سفرنامہ افغانستان میں لکھا ہے کہ "اس کی تعمیر حضرت بہاء الدین زکریا نے خود کرائی تھی اور یہاں بیٹھ کر چالیس برس تک حدیث کا درس دیا تھا" معلوم ہوتا ہے رسول اقدسؐ سے اس قلبی مناسبت کی بناء پر عاشق رسولؐ پر یہ کیفیت طاری ہوئی جو عین قرین قیاس ہے۔

یہاں یہ اشارہ اور کر دیں کہ ابتداء میں حضرت علامہ ذکر اور مراقبے کی لذت سے اپنے برادر بزرگوار کی خصوصی توجہ سے آشنا ہو چکے تھے۔ ندوہ کی تعلیم کے دوران علامہ شبلی سے خصوصی تعلق رہا۔ اور علامہ شبلی نے اس دور میں سیرۃ النبیؐ کا بیڑہ اٹھا لیا تھا۔ حصول تعلیم کے بعد بھی سیرۃ بورڈ میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے کئی مرتبہ کام لیا۔ علامہ شبلی نے وفات کے وقت سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کی وصیت کی تھی اور علامہ سلیمان ندوی نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ سیرۃ کی تکمیل تبویب، ترمیم و اضافہ اور سیرۃ کے مطالعہ

---

[1] ڈاکٹر غلام محمد: تذکرہ سلیمان: ادارہ مجلس علمی کراچی ص ۷۶، ۷۷، ۸۰، [2] علامہ سید سلیمان ندوی: سفرنامہ افغانستان۔ نفیس اکیڈمی۔

ہی میں صرف کیا۔ چونکہ اس تمام عرصہ قرآنِ کریم اور احادیث مقدسہ ہی اوڑھنا بچھونا رہیں۔ اس لئے ان دونوں چیزوں سے شغف ہونا بدیہی امر ہے۔ اور بڑے سے بڑا پیر، مرشد اور شیخ بھی اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کے سوا کیا سبق دے سکتا ہے۔ علامہ سے زیادہ اس چیز کو اور کون جان سکتا تھا۔ اس چیز نے قلب کو صاف اور روشن کر دیا یہی ذکر و فکر اور پاکیزگیٔ قلب و نظر تصوف کا منتہائے کمال ہے۔ جو علامہ میں پہلے سے بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس لئے جب مولانا بیعت ہوئے تو انہیں مجاہدہ و مکاشفہ کی منزل سے نہیں گزرنا پڑا اور یوں لگا کہ گویا علامہ اس مقام پر دفعتہً پہنچ گئے۔ اب ہم علامہ کی چند اور کرامات درج کرتے ہیں:۔

سقوط حیدرآباد ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ لیکن سیاسی کشمکش اور بے چینی اس سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ علامہ کے مرید با صفا ڈاکٹر غلام محمد صاحب حیدرآبادی نے ۲۰ نومبر ۱۹۴۷ء[1] کو مرشد سے حیدرآباد کی فضا اور اپنے مستقبل کے طرز عمل کے بارے میں استفسار کیا۔ علامہ اس وقت بھوپال میں قاضی القضاۃ تھے۔ آپ نے ۲۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو جواب دیا[2] "۔۔۔۔ حیدرآباد کو اپنے دو سو برس کی غلطی کا خمیازہ بھگتنا ہے"۔

ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے ۲۲ اپریل ۱۹۴۸ء[3] کو ایک عریضہ علامہ سید سلیمان ندوی کی خدمت میں بھوپال ارسال کیا اس میں اپنی اہلیہ کے خواب کی تعبیر دریافت کی۔ فرماتے ہیں:۔

"پرسوں اہلیہ نے خواب میں دیکھا کہ ان کے سر کے بال سب سفید ہو گئے ہیں"۔

علامہ نے ۲۷ اپریل کو جواب دیا:[4]

"شاید اولاد کی بشارت ہو واشتعل الراس شیبا"۔

ڈاکٹر غلام محمد صاحب رقمطراز ہیں:۔

"دریافت کرنے پر استقرار حمل کا علم ہوا"۔

موصوف اپنے مرشد سے مکتوب مرقومہ ۹ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ میں عرض کرتے ہیں[5]:۔

"بارہا کا تجربہ ہے کہ جب عالم پریشانی میں حضرت والا کی خدمت میں کوئی عریضہ گزارتا تو ادھر ڈاک میں خط پڑا اور ادھر طبیعت پر سکون طاری ہو جاتا ہے۔ خواہ اسباب فوراً فراہم نہ ہوں ــــــ بعد کو اسباب بھی فراہم ہو ہی جاتے ہیں۔ یہ برکت ہے حضرت والا کی (اور نشانی ہے عند اللہ مقبولیت کی)"۔

یہ مراسلت تو مرشد اور مسترشد کے درمیان ہے لیکن بات دل کو لگتی ہے۔

ڈاکٹر غلام محمد صاحب تذکرہ سلیمان لکھتے ہیں:۔

"جو چیز سامنے آتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ حضرتِ اقدس سے اس کی اصلیت بلا قصد و ارادہ بھی چھپ نہ سکتی تھی، چنانچہ ایک واقعہ سے اس کا اندازہ ہو گا۔

۱؎ ڈاکٹر غلام محمد: تذکرہ سلیمان: ادارہ مجلس علمی کراچی ۱۹۶۰ء ص ۵۵۴، ۲؎ ڈاکٹر غلام محمد: تذکرہ سلیمان: ادارہ مجلس علمی کراچی ۱۹۶۰ء ص ۵۵۵
۳؎ ۴؎ ۵؎ " " " " " ص ۵۰۵، ص ۵۲۳

"ڈاکٹر عبد الحئی مدظلہٗ کی دوا حضرت والا استعمال فرما رہے تھے۔ ہومیوپیتھی اصول کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے چونکہ ذہنی طاقت کی دوا دی تھی اس لئے چند روز توقف ضروری تھا۔ نفسیاتی تشفی کے لئے البتہ چند پڑیاں سادہ گولیوں کی باندھ کر بھجوا دی تھیں کہ روزانہ ایک پڑیا استعمال فرمایا کریں۔ حضرت والا نے پہلی ہی پڑیا ان میں کی جب استعمال فرمائی تو زبان پر گولیوں کے آتے ہی اتوبے فرمایا:۔ ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیجئے کہ میں کوئی نادان بچہ تو نہیں، اگر دوا کی ضرورت نہ تھی تو فرما دیتے کہ اتنے روز تک کسی دوا کی ضرورت نہیں۔ یہ سادہ گولیاں باندھنے کی کیا ضرورت تھی[1] میں دیدہ و دانستہ تو اس سے تشفی نہیں پا سکتا۔ ۔ ۔ ۔" دوسرے روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ بات پہنچا دی۔ تو ڈاکٹر صاحب بھی حیران رہ گئے۔ اور فرمایا کہ یہی نہیں کہ سادہ گولیاں دی تھیں بلکہ ان میں صاف الکحل بھی جذب کر دی تھی۔ تاکہ کوئی شبہ ہی پیدا نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر غلام محمد صاحب جو خود ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہیں۔ اس ذیل میں فرماتے ہیں۔ ہومیوپیتھک دوا میں جو کچھ ذائقہ یا بو ہوتی ہے وہ الکحل اور شکر ہی کی ہوتی ہے۔ ورنہ دوا تو اپنا کوئی ذائقہ نہیں رکھتی۔ اسی لئے بڑا سے بڑا ڈاکٹر بھی محض چکھ کر بتا نہیں سکتا کہ کیا دوا ہے؟ یا یہ ہے بھی یا نہیں؟

ڈاکٹر غلام محمد نے اپنا ایک واقعہ لکھا ہے جو بڑا ہی حیرت انگیز اور سبق آموز بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ موصوف کی شدید خواہش تھی کہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوں اور علامہ کی صحبت سے فیضیاب ہوں۔ لیکن اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے عریضہ لکھا اور دعا کی درخواست کی۔ چند ہی دن میں خود بخود اسباب پیدا ہو گئے۔ اور ڈاکٹر صاحب مرشد کی خدمت میں پہنچ بھی گئے۔ اور خوب خوب مرشد کے لطف و کرم سے مستفید ہوئے۔ یہ تو ہوا ہی۔ اب ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں[2]:۔

"حضرت والا کی ان ساری عنایات اور اس کی یکسوئی کے باوجود جو خدمت گرامی میں حاصل تھی دو ہی تین دن بعد ذہن میں ایک وسوسہ پیدا ہوا کہ یہاں آنے سے حاصل کیا ہوا؟ یہ نماز روزہ تو گھر پر بھی ہو ہی رہا تھا ——— اس وسوسہ سے بچنے کی وہ تمام تدبیریں اختیار کر لیں جو حضرت حکیم الامتؒ نے تجویز فرمائی ہیں، لیکن وسوسہ تھا کہ شدت ہی پکڑتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ مسلسل چوبیس گھنٹے اسی حالت میں گزر گئے۔ اور حضرت والا سے اس سلسلہ میں میں نے نہ کچھ عرض کیا نہ اس کی جرأت کر سکتا تھا۔ دوسرے دن عصر کی نماز کے لئے حضرت والا مسجد جا رہے تھے اور یہ خادم بھی ساتھ تھا۔ چلتے چلتے حضرت والا دفعتاً رک گئے چیں بہ جبیں ہو کر احقر کی طرف دیکھا اور ذرا ترش لہجے میں فرمایا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو آپ نے مجھ پر کوئی احسان کیا؟" بس یہ فرما کر پھر آگے چلے۔ احقر کو یوں محسوس ہوا کہ کسی نے سر پکڑ کر خوب اچھی طرح جھنجھوڑ دیا۔ اور وہ وسوسہ کافور تھا ——— بعد افطار جب عاجز نے اپنی حالت کا ذکر کیا متبسم ہو کر فرمانے لگے:۔

"ہمارے حضرت والا فرماتے تھے کہ جہاں خزانہ ہوتا ہے، چور وہیں نقب لگاتا ہے"

ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے شانِ محبوبیت کے عنوان سے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ بھی بڑا حیران کن ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ایک خلیفہ حافظ محمد یٰسین رحمۃ اللہ علیہ تھے، ان کے ایک مرید حافظ صاحب ہیں۔ پختہ سن اور بڑے بڑے بزرگوں کو دیکھے ہوئے ہیں مگر طبیعت کے آزاد اور کم ہی کسی کے معتقد ہوتے ہیں۔ ان کی رائے میں

---

[1] ڈاکٹر غلام محمد: تذکرہ سلیمان: مجلس علمی کراچی سنہ ۱۹۶۰ء ص ۴۸۳ تا ۴۸۶ [2] تذکرہ سلیمان: ص ۴۸۳ تا ۴۸۶

اب بزرگی تو رہی نہیں ہے۔ بس ایک نام رہ گیا ہے۔ بہرحال یہی حافظ صاحب ایک روز حضرت والا کی خدمت میں آئے اور اپنے انداز میں ہنس ہنس کر اور قہقہے لگا لگا کر کافی دیر تک حضرت سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور دوران گفتگو میں بھی کہہ ڈالا کہ مولانا، بزرگ تو مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا تھانوی تھے۔ اب بزرگ کہاں؟ حضرت والا ایک تو اجنبیت اور پھر اپنی افتاد طبع کی بنا پر اکثر خاموشی ہی رہے۔ کچھ دیر کے بعد حافظ صاحب رخصت ہو گئے۔ قصہ ختم ہو گیا۔ مگر دوسرے دن حافظ صاحب پھر آ موجود ہوئے ادب سے بیٹھے اور لجاجت سے اپنی گزشتہ بے تکلفانہ گفتگو کی معافی چاہی۔ حضرت والا نے فوراً فرمایا کہ دل صاف ہے۔ اس میں بات ہی کیا تھی۔

راقم (ڈاکٹر غلام محمد صاحب) کو حیرت ہوئی۔ خصوصاً حافظ صاحب کی طبیعت سے واقفیت کی بنا پر اور بھی تعجب ہوا کہ یہ کسی سے نہ دبنے والے آج خود بخود کیسے اس قدر نرم ہو گئے۔ جب حافظ صاحب حضرت سے اجازت لے کر بہ ادب رخصت ہوئے تو میں بھی باہر نکل گیا اور ان سے پوچھا کہ حافظ صاحب کیا قصہ ہے؟ زور سے ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ "ارے کچھ نہ پوچھئے رات خواب میں بڑی ڈانٹ پڑی، میں تو لرز گیا"۔

ہر چند خواب کی تفصیل پوچھی مگر انہوں نے بتانے سے انکار کیا اور صرف اتنا ہی فرماتے رہے "میں سید صاحب کو اس رتبہ کا انسان نہ سمجھتا تھا کہ ان کا ادب نہ کرنا آفت مول لینا ہے۔ میں تو آج سے ان کا قائل ہو گیا"۔

ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ "ہمارے ایک محترم برادر طریق نے بتایا کہ ایک روز حضرت والا لیٹے ہوئے تھے اور تنہائی تھی تو انھوں نے پاؤں دابنے کی اجازت چاہی۔ ایسی اجازت بھلا کہاں مل سکتی تھی۔ مگر ان کے جوش عقیدت کی رعایت فرما کر حضرت نے ہاتھ کی طرف اشارہ فرمایا۔ محب گرامی نے اپنا ہاتھ جیسے ہی حضرت کے بازو پر رکھا تو ان کے سر سے پاؤں تک ایک برقی رو سی دوڑ گئی جس میں حرارت وحلاوتِ ذکر کا اثر تھا۔ وہ حضرت اقدس کا بازو دباتے رہے اور اس بات کو مسلسل محسوس کیا کہ جب ان کا ہاتھ جسم مبارک سے ہٹ جاتا تو وہ برقی رو منقطع ہو جاتی اور جب وہ مس کرتا تو وہ برق پھر سارے جسم میں کوند جاتی۔ جب یہ خدمت ختم ہوئی تو وہ کیفیت بھی جاتی رہی۔ یوں تو حضرت سید صاحب کی کرامات کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ بقول شخصے ؏ سفینہ چاہئے اس بحر بے کراں کے لئے

ہم صرف ایک کرامت کا اور ذکر کرتے ہیں۔ یہ بھی تذکرہ سلیمان ہی[1] سے اخذ کی ہے۔ علامہ مئی ۱۹۴۵ء میں استسقائے قلبی کا شکار ہو گئے۔ سانس لینا، اٹھنا بیٹھنا محال ہو گیا۔ آٹھ شب و روز کھڑے کھڑے گزارنے پڑے۔ پاؤں ورم کر گئے۔ غرض اس پر صبر و استقامت خود ایک کرامت تھی مگر اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ایک اور کرامت کا ظہور ان آٹھ دنوں کے ہر دن میں پانچ بار برابر ہوتا رہا ہے اور قریب کے لوگ محو حیرت بن کر اس کا بار بار مشاہدہ کرتے رہے۔ وہ کرامت یہ تھی کہ جب نماز کا وقت آ جاتا تو حضرت والا کی چھوٹی صاحبزادی سلمہا وضو کرواتیں۔ ہاتھ منہ کو حضرت خود دھو لیتے، پاؤں دھلانے کی سعادت صاحبزادی کو حاصل رہتی۔ پھر حضرت والا کو بہ وقت تمام مصلی پر کھڑا کر دیا جاتا اور لوگ ہٹ جاتے۔

اب اللہ کا بندہ اپنے رب کے حضور میں کھڑا ہے۔ اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لئے گئے ہیں۔ اب نہ جانے قرب کے کن

---

[1] ڈاکٹر غلام محمد: تذکرہ سلیمان: ادارہ مجلس علمی کراچی ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶

منازل میں وہ گم ہے کہ اپنے مرض کا خیال ہے نہ بے طاقتی ارکانِ نیازمندی میں حائل ہے۔ چشم بصیرت دیکھ رہی ہے کہ وہ عبدیت کا پیکر رکوع میں جھکا پھر کھڑا ہوگیا۔ پھر بے تکلف سجدے پر سجدے کئے جا رہا ہے۔ نہ کوئی آہ ہے۔ نہ کوئی کراہ۔ فرض نماز اسی طرح پوری ادا ہوگئی البتہ دوسرا سلام پھیرتے ہی ایک دلگداز چیخ سنائی دیتی تھی۔ اور حضرت والا گر پڑتے تھے۔ اعزا فوراً اٹھا کر دیوار کے سہارے کھڑا کر دیتے۔ اس طرح آٹھ دن میں چالیس بار دیکھنے والوں نے اس اعلیٰ ترین کرامت کا مشاہدہ کیا اور خود اپنے ایمان والیقان میں تقویت پائی۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات
اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات
میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع
کی جاتی ہیں، ان کا احترام آپ پر
فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر
یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی
طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

اقبال ــــ ایک تنقیدی جائزہ

پروفیسر محمد رفیع عالم

مولانا حالی کی روایت سے وابستہ جدید ادبی فکر اور قومی شاعری کو فروغ دینے اور تقویت پہنچانے والے شاعروں میں اقبال کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ غالب اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعری کو فلسفیانہ لہجہ عطا کرنے کی روایت قائم کی اور حالی اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قومی شاعری کو مستحکم بنیاد پر استوار کرنے کا سلیقہ عام کیا۔ اقبال نے غالب سے فلسفے کو شعر کا جزو بنانے اور حالی سے شاعری کے ذریعہ قوم میں بیداری اور عمل کا جذبہ پیدا کرنے کا طریقِ کار سیکھا اور غالب اور حالی دونوں کی روایات کو اپنا کر شاعری کو ایک ایسی جہت اور سمت عطا کی جو عہدِ جدید کے تقاضوں اور مسائل پر ہر اعتبار سے محیط ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں مغرب کے زیرِ اثر جو فکری، ادبی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی تحریکیں وجود میں آئیں انھوں نے ہماری زندگی کو جدید اقدار سے ہم آہنگ کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ سرسیّد، حالی، شبلی اور آزاد نے نئی زندگی کو بڑی فراخ دلی سے قبول کیا۔ سرسید اور حالی نے خاص طور پر نئی قدروں کو عام کرنے اور ان سے کام لے کر قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی نہایت مستحسن کوششیں کیں۔ ان تحریکوں سے براہِ راست متاثر ہونے والے شعراء میں اقبال کی حیثیت سب سے نمایاں ہے۔

اقبال کی شعر گوئی کی ابتدا اس وقت کے عام رواج کے مطابق غزل سے ہوئی۔ اقبال نے جب شاعری شروع کی تو اس وقت داغ کا بول بالا تھا اور ان کا رنگ لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ اس لیے بیشتر شعراء داغ سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور انھیں کے طرز میں شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شعراء بھی جو داغ کے شاگرد نہیں تھے داغ کی مقبولیت کے پیشِ نظر ان کے رنگ کی تقلید کو منتہائے کمال سمجھتے تھے۔ اقبال نے بھی ابتدا میں داغ ہی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ داغ اور اقبال میں فکری اعتبار سے بڑا فرق تھا لیکن داغ کی اصلاح کا ایک بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ اقبال کی زبان میں سلاست اور روانی کے ساتھ فصاحت پیدا ہو گئی۔ اقبال کی ابتدائی غزلوں سے چند اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں جن سے ان کے

ابتدائی رنگ تغزل اور اس پر داغ کے اثر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

بلاکشانِ محبت کی یادگار ہوں میں — مٹا ہوا خطِ لوحِ سرِ مزار ہوں میں
نشے میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ — وہ اپنا وعظ کہے جائے ہوشیار ہوں میں

جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں — پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں
ایسی ذلت ہے مرے واسطے عزت سے سوا — خود وہ اٹھ کر مجھے محفل سے اٹھا دیتے ہیں

اے حبابِ بحر اے پروردۂ دامانِ موج — کچھ پتا ملتا ہے تجھ سے اپنی ہستی کا مجھے
کھل گئی چشمِ تماشا اپنی جس دم اے کلیم — طور ہر ذرے کے دامن میں نظر آیا مجھے

لیکن اس قسم کی غزل گوئی اقبال کا مزاج نہیں تھی۔ چنانچہ اس کے ساتھ انھوں نے نظمیں بھی کہنا شروع کیں اور اپنی پہلی قومی نظم ۱۸۹۸ء میں "نالۂ یتیم" کے نام سے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں نہایت سوز و گداز سے پڑھی۔ اس نظم سے ان کی قومی شاعری کا آوازہ برصغیر کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے لاہور کی ایک ادبی مجلس میں اپنی نظم "ہمالہ" پڑھی۔ ہمالہ کے علاوہ "نیا شوالہ"، "ایک آرزو"، "تصویرِ درد"، "قومی ترانہ" وغیرہ جیسی نظمیں لکھیں جن سے حب وطن کے جذبے کا مکمل اظہار ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ نظمیں اس امر کا واضح پتا دیتی ہیں کہ اقبال اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں وطنیت کے جذبے سے سرشار تھے۔

پھر اقبال نے مزید تعلیم کی غرض سے یورپ کا سفر اختیار کیا۔ وہ ۱۹۰۵ء میں اس سفر پر روانہ ہوئے اور یورپ میں تین سال کی مدت گزاری۔ فلسفہ، قانون اور علمی تحقیقات کا شوق انھیں یورپ لے گیا تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ و اخلاق کی ڈگری لی اور جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے فلسفۂ ایران پر تحقیقی کام کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی (ڈاکٹر آف فلاسفی) کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی کتاب "فلسفۂ ایران" لندن میں شائع ہوئی تھی جس پر وہاں کے اخبارات و رسائل میں تبصرے ہوئے اور وہاں اہل علم نے اس کتاب کو پسند کیا۔ جرمنی سے واپس لندن آکر "اسکول آف پولیٹیکل سائنس" میں داخلہ لیا اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ قیام یورپ کے دوران میں حصول تعلیم کی مصروفیات کے باوجود "اسلام" پر کچھ لیکچر دیے جو نہایت مقبول ہوئے۔ ان لیکچروں سے ان کی مذہبی تحقیقات کا بڑا شہرہ ہوا۔ یورپ کے قیام کے دوران میں انھوں نے جو نظمیں لکھیں وہ عموماً مخزن (لاہور) میں شائع ہوتی رہیں۔ اپنی مشہور نظم "جزیرۂ صقلیہ" (سسلی) یورپ جاتے ہوئے اس کے اسلامی عہد کو یاد کر کے تختۂ جہاز پر لکھی تھی۔ "والدہ مرحومہ کی یاد" بھی لندن میں لکھی۔ اس نظم میں فلسفۂ حیات و موت پر پہلی بار اظہارِ خیال کیا۔

یورپ سے واپسی پر اقبال بمبئی، دہلی اور انبالے میں قیام کرتے ہوئے ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء پیر کی شام کو لاہور پہنچے جہاں ان کے اعزاز میں ایک پارٹی دی گئی جس میں بعض احباب نے نظمیں بھی پڑھیں۔

یورپ کا سفر اقبال کے لیے کئی لحاظ سے نہایت اہم ثابت ہوا۔ انھوں نے یورپ کی سائنسی ترقی دیکھی اور اسی کے ساتھ ان کا اخلاقی اور تہذیبی زوال بھی دیکھا۔ سائنسی ترقی کے بل بوتے پر مغرب نے مشرق پر مادی حیثیت سے فوقیت ضرور حاصل کر لی اور مشرقی علاقوں خاص کر مسلم ممالک پر اپنا اقتدار اور تسلط قائم کر کے انھیں اپنے زیر نگیں کر لیا لیکن روحانی اعتبار سے مغرب کھوکھلا ہو گیا۔ اس کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی اصول روحانی اور اخلاقی اقدار کو ترقی دینے یا انھیں برقرار رکھنے میں کسی طرح ممد و معاون ثابت نہ ہو سکے۔ دوسری طرف مسلم ممالک کی غلامی اور مسلمانوں کی زبوں حالی سے اقبال بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ یورپ کے سفر سے پہلے ان پر وطنیت کا جذبہ طاری تھا اور وہ وطن کا نغمہ اس انداز سے گا رہے تھے کہ:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

مگر یورپ کے سفر سے واپسی کے بعد وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ دورِ حاضر کا نظریۂ وطن دنیا میں لوٹ کھسوٹ، قتل و غارتگری اور جنگ و جدل کا پیش خیمہ ہے۔ وطنیت ایک محدود نظریہ ہے جو انسان کو رنگ و نسل میں تقسیم کر دیتا ہے اس کے برخلاف اسلام کا نقطۂ نظر عالمگیر اور بین الاقوامی حیثیت کا حامل ہے۔ اس اعتبار سے مغرب کا نظریۂ وطن اسلام کے عالمگیر نظام کے منافی ہے۔ چنانچہ وطنیت کے بارے میں وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

چنانچہ انھوں نے وطنی ترانے کے جواب میں ملّی ترانہ لکھا:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وطنیت سے اسلام کی ہمہ گیری کی طرف سفر اقبال کی شاعری کے لیے نیک فال ثابت ہوا۔ اب انھوں نے اپنی شاعرانہ کاوشوں کو ملّتِ اسلامیہ کو جگانے، ان میں بیداری کا جذبہ پیدا کرنے اور اپنی گزشتہ عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد قرآن اور حدیث نبویؐ پر رکھی اور مسلمانوں کو ان کے صحیح مقام سے آگاہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ دنیائے اسلام کے زوال اور اس پر یورپی ممالک کے تسلط سے سخت رنجیدہ تھے اور اس بات کے متمنّی تھے کہ دنیا میں اسلام کا دوبارہ بول بالا ہو۔ چنانچہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے مسلمانوں کو بیداری کا پیغام دیا اور اس کے لیے انھوں نے مروجہ الفاظ مثلاً عقل و عشق، خودی، عمل و حرکت، حیات و موت وغیرہ کو نئے معنی و مفہوم عطا کئے۔

اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمان کتاب و سنت کی پیروی سے اپنی نشو و نما اور ارتقا کی تمام صلاحیتوں کو بیدار کر لیں۔ انھوں نے انسان کی ان فطری صلاحیتوں کو جو انسان کی فطرت میں نشو و ارتقا کے لیے تڑپتی رہتی ہے لفظ "خودی" سے تعبیر کیا ہے اور اپنے پیغام کا مرکز خودی ہی کو قرار دیا ہے۔ انھوں نے خودی کی بیداری کے لیے جذبۂ عشق، ایمان و یقین، فقر و غنا، حریت، جذبۂ اخوت، مساوات اور دینداری پر زور دیا ہے۔ دورِ حاضر کی تعلیمات اور تہذیب مغربی چونکہ مذکورہ صفات سے خالی ہے اس لئے انھوں نے مغربی تہذیب، مغربی سیاست اور مغربی تعلیمات میں پوشیدہ

خطرات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔

اقبال کے نزدیک خودی عرفانِ ذات ہے۔ جب تک آدمی اپنے آپ سے واقف نہیں ہو لیتا اور جب تک وہ اپنے اندر پوشیدہ جوہر اور قوتوں سے آشنا نہیں ہوتا وہ دنیا میں کوئی کارنمایاں انجام نہیں دے سکتا۔ خودی انسان کو ایسے کارنامے انجام دینے کے قابل بنا دیتی ہے کہ عقل محوِ حیرت رہتی ہے۔ خودی انسان کو اس مقام بلند تک پہنچا دیتی ہے جہاں فرشتے بھی پر نہیں مار سکتے۔ انھوں نے خودی کی طرح طرح سے تشریح و تفسیر بیان کی ہے:

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے ۔۔۔ خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات ۔۔۔ خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی ۔۔۔ ہر ذرہ شہیدِ کبریائی
رائی زورِ خودی سے پربت ۔۔۔ پربت ضعفِ خودی سے رائی

خودی سوال (گداگری) سے کمزور اور غلامی اور بندگی میں مر جاتی ہے:

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب ۔۔۔ وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند ۔۔۔ رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

دنیا خودی کو بیدار کرنے کی جگہ ہے۔ یعنی دنیا جائے عمل ہے، جائے قرار و قیام نہیں:

خودی کی یہ ہے منزلِ اولین ۔۔۔ مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں ۔۔۔ جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
خودی شیر مولا جہاں اس کا صید ۔۔۔ زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار ۔۔۔ کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

دوسری جگہ کہتے ہیں:

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات ۔۔۔ کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم ۔۔۔ خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات

خودی جب بیدار ہوتی ہے تو عالم کو تسخیر کر لیتی ہے:

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی ۔۔۔ کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے تری بندگی اسی سے ۔۔۔ جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

خودی کے آگے بادشاہ بھی ہیچ ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ وہ بادشاہی جو خودی کی موت سے حاصل ہو کسی لائق نہیں:

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن ۔۔۔ خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

ذلّت و خواری کا باعث خودی کا زوال و انحطاط ہے ۔ تقدیر یا قسمت کا اس میں دخل نہیں :

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازئ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ
خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

عشق خودی عشق سے بیدار ہوتی ہے ۔ اقبال نے عشق و جنوں کو وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ عشق سے مراد عشقِ الٰہی، عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، عشقِ حمایتِ حق اور عشقِ بنی نوع انسان ہے ۔ چونکہ مصائب اور مشکلات پر قابو پانے کے لیے جفاکشی، سخت کوشی اور جد و جہد کی سخت ضرورت ہے ۔ اس لیے اقبال کا عشق جس سے خودی بیدار اور قوی ہوتی ہے سینہ گداز اور خارا شگاف ہے ۔ بے خوف، بے باک اور نڈر ہے ۔ اللہ کے سوا کسی سے ڈرتا ہے اور نہ کسی کے سامنے سر جھکاتا ہے ۔

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل تھی محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

عشق دمِ جبرئیل عشق دمِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسولؐ، عشق خدا کا کلام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اقبال عشق اور علم کا مقابلہ اس طرح کرتے ہیں :

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن، کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

عشق کے بغیر علم میں سرور و سوز نہیں پیدا ہوتا اور علم بے راہ و گمراہ ہو جاتا ہے۔

علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں — عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

ایمان و یقین: عشق ایمان و یقین سے تکمیل پاتا ہے اور جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو بندۂ عاشق بندۂ مومن کے عظیم مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ یقین و ایمان ہی دراصل عمل اور زندگی کی بنیاد ہے:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا — بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں
یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے — یہی قوت ہے جو صورت گرِ تعمیرِ ملت ہے

ایمان و یقین کے لیے زوال اور فنا نہیں:

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں — اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

جب عشق ایمان و یقین کی قوت سے محکم اور استوار ہو جاتا ہے تو عاشق مومن بن جاتا ہے اور اقبال کہتے ہیں یہی انسانیت کی معراجِ کمال ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

سخت کوشی: سخت کوشی اور جفا طلبی عشق کے لوازمات میں سے ہیں۔ ہنگامہ خیزی، جد و جہد اور حرکت زندگی کی نشانیاں ہیں اور سکون و راحت موت کا دوسرا نام ہے۔ زندگی اور خودی کی بیداری، بالیدگی اور ترقی کا انحصار عمل، جد و جہد اور حرکت پر ہے:

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ — جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

ایک جگہ اسی حقیقت کو شاہین کی زبان سے اس طرح بیان کرتے ہیں:

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر — وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

عمل اور جد و جہد کے بہتر نتائج کو اس انداز سے ظاہر کرتے ہیں:

دریا میں موتی اے موجِ بے باک — ساحل کی سوغات، خار و خس و خاک

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں　　　تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

چنانچہ اسی اصول کے تحت اقبال کے نزدیک چونکہ وصل میں سکون ہے اس لیے وصل عشق کی موت ہے۔ فراق میں درد و کرب اور سوز و گداز ہے اس لیے فراق میں عشق کے لیے لذت ہے:

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق　　　وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

سکون زندگی کے لیے موت کا پیغام ہے:

ترا بحر پُر سکوں ہے، یہ سکوں ہے یا فسوں ہے　　　نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابیٔ کنارہ

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں　　　کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے　　　زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

فقر و غنا　ایمان و یقین کے بعد عشق کا بڑا ہتھیار فقر و غنا ہے۔ موجودہ مادی دور میں اسلامی فقر اقتصادیات کے بہت سے مسائل حل کر سکتا ہے۔ فقر کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ہاتھ پاؤں توڑ کر بے عملی کی زندگی گزارے بلکہ اقبال کے مطابق فقر یہ ہے:

اس کی بڑھتی ہوئی بے تابی و بیباکی ہے　　　تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم
اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور　　　کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم

فقر اور گداگری میں جو واضح فرق ہے اقبال اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

کچھ اور چیز ہے شاید تیری مسلمانی　　　تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار　　　فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

فقیری کے سامنے دنیاوی سلطانی و شہنشاہی ہیچ ہے:

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے　　　وہ کیا تھا، زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اچھا　　　ہو جس کی فقیری میں بوئے اسداللّٰہی
نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے　　　جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اقبال فقر اور علم کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ　　　فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد　　　فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم　　　علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ

فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر   فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ

مجموعی حیثیت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کی ملّی شاعری قرآن اور احادیث نبویؐ پر مبنی ہے اور وہ قوم وملت کے لیے بیداری کا ایک بھرپور اور توانا پیغام ہے۔ خودی، عشق اور عمل جیسے الفاظ کو انھوں نے روایتی معنی سے الگ ایک نیا فلسفیانہ مفہوم دیا اور اس سے مسلمانوں کے اندر بیداری کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی شاعری عظمتِ انسانی کا بھی بڑا بھرپور اعتراف ہے ۔۔ وہ انسان کو تمام مخلوقات میں اعلیٰ وارفع سمجھتے ہیں اور اس کے اندر چھپے ہوئے روشن امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تسخیر کائنات کو انسان کا مقصد قرار دیتے ہیں جس کی کامیابی اسی حال میں ممکن ہے کہ انسان اپنی پوشیدہ طاقت سے واقف ہو۔ وہ انسانی ترقی کے دل سے قائل ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ چاند تاروں پر کمندیں پھینک کر انھیں اپنا اسیر بنالینا انسان کے لیے ممکن نہیں۔ انسانی عزم واستقلال اور ترقی کی راہ پر اس کی تیز گامی کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان نے خلائی پرواز کا سہارا لے کر چاند کے سینے پر اپنی فتح یابی کا پرچم گاڑ دیا ہے اور وہ دوسرے سیاروں کو بھی تسخیر کرنے میں مصروف ہے تو ہمیں اقبال کی شاعری اور ان کے پیغام کی سچائی کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ یہی وہ اوصاف ہیں جن سے اقبال کی شاعرانہ عظمت عبارت ہے اور جو اقبال کی حیات جاوداں کی بھی ضمانت ہیں۔

اردو کے عظیم شاعر میر کے بارے میں ایک اہم تحقیقی وتنقیدی کتاب

محمد تقی میر

مصنفہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

قیمت:۔ پچیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

غیر افسانوی طرزِ تحریر - اہمیت و افادیت

پروفیسر یونس شرر

آج مغربی دنیا میں غیر افسانوی طرزِ تحریر (Non - Fiction Writing) کو وہی قبولیت حاصل ہے جو ایک زمانے میں افسانوی طرزِ تحریر (Fiction Writing) کو حاصل رہی ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ افسانوی طرزِ تحریر اپنانے والے مصنفین نے تیزی کے ساتھ اس خلا کو پر کیا ہے جس کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا تھا آج مغربی رسائل، ڈائجسٹ اور اخبارات جن خطوط پر مرتب کیے جا رہے ہیں انھیں دیکھ کر اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیق اور علم کو بیان کرنے کے لیے جس نئی زبان، انداز اور طرزِ تحریر کی ضرورت تھی اسے غیر افسانوی طرز نے بہ حسن و خوبی اپنے اندر سمیٹ لیا ہے اور اس کی ترجمانی کا صحیح طور پر حق ادا کیا ہے۔ اب یہ طرزِ تحریر جدید عہد کی ضرورت بن گیا ہے اور قارئین کے عام میلان اور رجحان سے مماثلت رکھتا ہے، آج قارئین جس وضاحت اور صفائی کے ساتھ حقائق اور معارف سے آگاہی چاہتے ہیں یہ طرزِ تحریر اس کی مکمل نمائندگی کرتا ہے۔

تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں وقت کے تیز و تند سیلاب نے فرصت کے لمحات کو بہت ہی محدود کر دیا ہے آج ایک پل اور ایک لمحے میں نتائج اور فیصلوں کے امکانات بدل جاتے ہیں۔ اس تیز رفتار تغیر و تبدل اور ترقی نے ذہنی رویے، علمی سطح اور ابلاغ کی شکلوں کو بدل دیا ہے۔ اس لیے قارئین کی بڑی تعداد نہ علامتوں اور اشاروں کے پھیر میں الجھنا پسند کرتی ہے اور نہ ہی تہہ در تہہ معنی کی کھوج میں سر کھپانے کی فرصت اسے میسّر ہے۔

افسانوی طرزِ تحریر اپنانے والے مصنفین کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ وہ تیز رفتار انسان کے ارتقائی سفر کا ساتھ نہیں دے سکے۔ ان مصنفین کی تحریریں اپنے مخصوص انداز، معیار اور فن و تکنیک کے اعتبار سے انسان کے ذہنی و علمی سرمایے میں اضافے کے لیے پیش کی جاتی ہیں اور یہ مصنفین اپنے علم، قوتِ مشاہدہ اور تجربات سے معارف و حقائق کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ کائنات اور حیات کی تفسیر اور تصویر کشی اس پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ انسان کے شعوری ارتقا میں مددگار و معاون ثابت ہو۔

اس معیار اور وصف کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے افسانوی طرزِ تحریر کے مقابلے میں غیر افسانوی طرزِ تحریر زیادہ بہتر اور افادی صورت اختیار کیے ہوئے ہے، ان مصنفوں کی تحریروں کا احاطہ ایک نئی امکانی دنیا کا تصور ہے، چشم دید حقایق اور واقعات اور معلومات کے خزائن و دفائن اور ایجادات کے حیران کن انکشافات اور تفصیلات میں زمین

کی تہہ اور خلاء سے ایک نیا رشتہ اور حقائق کی ایک نئی دستاویز ہے۔ نئے نئے موضوعات کے لیے بدلتے ہوئے معاشی اور معاشرتی حوالے ہیں، اب علمی سطح پر بھی غیر افسانوی تحریروں کا معیار، موضوع، مواد، خیال، اور فن و تکنیک کے اعتبار سے کسی ادیب، شاعر اور مفکر کی تخلیق سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔

غیر افسانوی طرزِ تحریر (Non-Fiction Writing) سے میری مراد کوئی عجوبۂ روزگار صنفِ سخن یا تحریر نہیں ہے: عام طرزِ تحریر کی بہتر فنی اور تکنیکی شکل ہے، اس طرزِ تحریر سے ہر تعلیم یافتہ آشنا ہے، زندگی کے امور کی انجام دہی کے لیے وہ روزمرہ کے کاموں کی طرح آشنا ہے اور اس طرزِ تحریر کو موقع بہ موقع استعمال بھی کرتا ہے، مراسلہ، خط و کتابت، تقریر لکھنے کی ضرورت، کسی خاص موقع پر مخصوص موضوع پر اظہارِ خیال، یہ سب غیر افسانوی طرز کی تحریریں ہیں، یہی اس فن کی بنیاد اور اساس ہے۔ اب کیونکہ یہ ایک فن کی صورت اختیار کر گیا ہے، اس لیے اس کے کچھ تکنیکی اصول، قواعد و ضوابط بھی مرتب کر لیے گئے ہیں۔ جس کا علم اور آگاہی ابھی بہت کم لوگوں کو ہے۔ آج کل غیر افسانوی طرزِ تحریر کے فن اور تکنیک پر مغربی دنیا میں بڑا کام ہو رہا ہے تاکہ اس طرز کو اپنانے والے مصنفین بہتر اور معیاری مسودات پیش کریں۔

صنعتی عہد کے بعد آج سائنس اور ٹیکنالوجی دنیا کو ایک مرکز پر لے آئی ہے، دور دراز علاقوں اور خطوں سے ہم اس طرح قریب ہو گئے ہیں جیسے شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر کھڑے ہوں، آج دنیا کے کسی بھی خطے میں رونما ہونے والے معمولی یا غیر معمولی واقعے کے حقائق اور تفصیلات سے چند سیکنڈوں میں آگاہی حاصل کر لیتے ہیں، ذہنی رابطے، وسیلے اور شعوری ارتقاء کی اس منزل پر پہنچ کر لازم ہے کہ معلومات، صاف، واضح اور حقیقی انداز میں حاصل ہوں، اس بیان کے لیے ایسا ہی طرزِ تحریر درکار ہے اور یہ طرزِ تحریر غیر افسانوی ہوگا جس فن سے آگاہی کے ساتھ قدرت و دسترس بھی چاہیے۔

آج مغربی دنیا میں اس طرز کو باقاعدہ ایک فن کی حیثیت حاصل ہے، یہ فن موضوع، مواد اور تکنیک کے پھیلاؤ کے باعث ایک بڑے تجارتی شعبے میں تبدیل ہو رہا ہے۔ تجارتی شعبے میں تبدیلی نے اس طرزِ تحریر کی وقعت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ مغرب میں اس طرزِ تحریر کے مصنفین کی اکثریت نے اس فن کو پیشے کے طور پر اپنایا ہے وہ تجارتی اور کاروباری اصولوں کے مطابق اس فن سے وابستہ ہیں کیونکہ اس طرزِ تحریر کو اپنانے والے مصنفین کی تحریریں ٹھوس حقائق اور معلومات کے باعث عوام کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں اور قارئین کی بڑی تعداد میں ان تحریروں کی مانگ ہے۔ مغربی دنیا میں اس طرز کے پیشہ ور لکھنے والوں نے اشاعتی اداروں، اخبارات، رسائل اور ڈائجسٹوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ان کے مسودات کی اشاعت کے لیے شرائط اور معاہدے کریں، موضوع اور مواد سے قطع نظر مصنف کی ساکھ اور مقبولیت کے معاوضے کا بھی تعین کریں، آج مغرب میں کوئی تحریر مصنف کی اجازت کے بغیر نہ چھاپی جا سکتی ہے اور نہ ہی بلا معاوضہ اس مقصد کے لیے حاصل کی جا سکتی ہے۔ معاوضے کا جہاں تک تعلق ہے، مصنف کو اس کی تصنیف کا اتنا بھاری معاوضہ ادا کیا جاتا ہے کہ بعض مصنف اپنی ایک ایک تصنیف کی بدولت شہر کے امراء معززین اور دولت مندوں میں شمار ہونے لگتے ہیں اور ایک ہی جست میں ان کی زندگی قابلِ رشک بن گئی ہے۔

مغرب نے جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی میں تیز رفتاری سے ترقی کی ہے، اسی تیزی کے ساتھ مغربی اشاعتی

اداروں اور مصنفین نے پیش رفت کی ہے اور علمی سطح پر عوام کو باخبر رکھنے میں اس طرزِ تحریر کے ذریعے بڑا کام انجام دیا ہے۔ قارئین عام طور پر کتابیں، رسائل، ڈائجسٹ اور اخبار اس لیے خریدتے ہیں کہ ان کو پڑھنے سے ان کے علم میں اضافہ ہوگا اور ان کا رابطہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا سے قائم رہے گا۔ لیکن ہمارے یہاں غیر افسانوی طرزِ تحریر ابھی تک اجنبی ہے نہ اس طرز کی افادیت سے ہم باخبر ہیں نہ اس کی ضرورت کے احساس و شعور سے آگاہ، اس کے فن اور تکنیک کا سوال تو دور کی بات ہے، ہماری کتابیں، رسائل، ڈائجسٹ، اخبار ایک فارمولے کے پابند اور یکسانیت کا شکار ہیں نئے نئے حقائق و معارف اور معلومات سے عاری ہیں۔ نئی زندگی اور اس کے رجحانات و میلانات سے بے خبری فرسودہ لبادے میں سمٹے ہوئے ہیں۔ کتابوں کو دیکھیے تو اِدھر اُدھر کی کتر بیونت سے مزین جو شوکیس میں سجی کسی خریدار کی برسوں منتظر رہتی ہیں، رسائل اور ڈائجسٹ تنہائی کے اوقات یا سفر میں وقت گزاری کے لیے خریدے جاتے ہیں جو جاسوسی یا دیومالائی مواد پر مبنی ہوتے ہیں یا قومی ملکی بساط پر بچھی ہوئی سیاسی اور چٹ پٹی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ ان کے ذریعے نہ مطالعے کے شوق و ذوق میں اضافہ ہوا اور نہ ہی ان کی مانگ بڑھی جس کے باعث ان کی اشاعتیں محدود پیمانے پر ہوتی ہیں۔

اشاعتی اداروں کے علاوہ ہمارے مصنفین کا بھی یہی حال ہے، ان کی صفوں پر نظر ڈال جائیے اپنے سابقہ علم اور تحقیق پر نازاں اور لکیر کے فقیر بنے مذہب و معاشرت کی عینک سے دنیا کو تنگ دائرے میں مقید کیے ہوئے، قشقہ کھینچے، لنگوٹ باندھے اکھاڑے میں اترنے کے لیے بے چین نظر آئیں گے۔ کچھ معاشرتی و سیاسی بے لگامیوں کا تذکرہ کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں گے، کچھ مضمون نگار یا کالم نگار نئے بشری علم کی طرف اگر آواز بھی دیں گے تو نقار خانے میں ان کی یہ آواز کہاں سنائی دے گی۔ علمی شعبے میں بھی ہماری غفلت وہی ہے جو قومی اور ملکی زندگی سے تعلق رکھنے والے دوسرے شعبوں میں ہے۔ دوسری ایشیائی قوموں کی طرح ہمارا یہ رویہ بڑا تشویشناک ہے۔ نئے عہد کی بشارتوں اور انکشافات سے غفلت کسی بھی سانحے اور حادثے سے دوچار کر سکتی ہے اور یہ غفلت ذہنی پسماندگی کے عالم میں معاشی و معاشرتی تباہی و بربادی سے ہم کنار کر سکتی ہے اور آزادی کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی نے ہمیں ۲ + ۲ = ۴ پر لا کھڑا کیا ہے اس لیے ہمیں ایک ایسے واضح اور حقیقی طرزِ بیان کو اپنانے کی ضرورت ہے، نئی دنیا اب ادب و شعر سے ہٹ کر ایک نئے امکانی طرزِ تحریر کی متلاشی ہے اور یہ امکانی طرز غیر افسانوی ہے جو اپنی نوعیت اور افادیت کے اعتبار سے قارئین کے ذہنی رویے اور میلان سے زیادہ قریب ہے، بیرونی دنیا میں اخباری صنعت اور اشاعتی اداروں نے اس طرزِ تحریر کو بڑے پیمانے پر پھیلانے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے جس کے باعث ایک عام شہری اور معمولی تعلیم یافتہ فرد کی بھی دلچسپی تحریر سے برقرار رہی ہے اور ان ملکوں کے قارئین کی اکثریت نئے نئے علوم اور تازہ ترین معلومات اور علم سے بہرہ ور نظر آتی ہے۔

افسانوی طرزِ تحریر کے اپنانے والے مصنفین نے اپنی مقبولیت کھو جانے کے باعث علامت اور ابہام نگاری کی راہ پر چل کر اپنی تحریروں کو اور زیادہ پیچیدہ اور گنجلک بنا لیا ہے اور دنیا سے رابطے کے بجائے اپنی ذات میں محدود اور تنہائی

کے احساس میں اسیر نظر آتے ہیں' ذات کے حوالے سے' داخلی اور بیرونی دنیا کے لیے ان کا نقطۂ نظر اکثریت کے برعکس ہے' ان کے برعکس غیر افسانوی طرزِ تحریر کو اپنانے والے مصنفین جس دنیا کی تصویر کشی کر رہے ہیں وہ اس کی حقیقی اور واقعی صورتِ حال صاف اور واضح انداز میں لکھ رہے ہیں۔ یہ تحریریں انکشافات اور معلومات کے ساتھ حیران کن دل چسپیوں سے عبارت ہیں اور اپنے اثر کے اعتبار سے علمی' عملی اور ذہنی تحریکات کا ایک حصہ بنتی جا رہی ہیں۔

آج بیرونی ممالک میں اشاعتی اداروں سے وابستہ یا اخباری صنعت کے ملازم پیشہ افراد پر صرف انحصار نہیں کیا جاتا بلکہ نئے نئے موضوعات' انکشافات اور نئی نئی معلومات کے لیے ان کا رابطہ آزاد اور پیشہ ور لکھنے والوں سے بھی ہوتا ہے جن کی تحریریں مواد اور خیال کے اعتبار سے زیادہ قابلِ قدر ہوتی ہیں اور قارئین کے لیے دل چسپی کا سبب۔ مثلاً ٹیلی وژن پر پیش کیے جانے والے ڈرامے' افسانے یا شعری ادب کے مقابلے میں ناظرین کی دل چسپی اس رپورٹ سے زیادہ ہوتی ہے جو افریقہ کے جنگلی جانوروں کی زندگی کے کوائف پر بنائی گئی ہو یا جس رپورٹ میں سمندری مخلوقات کی تفصیلات پیش کی گئی ہوں یا وہ فلمیں جس میں نئی ایجادات اور انکشافات کو مرکز بنایا گیا ہو۔ اس بیان سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ آج کے انسان کے ذہنی رویے' رجحان اور دل چسپی کے سامان میں بڑی تبدیلی پیدا ہوئی ہے' نئی دنیا سے ہماری دل چسپیاں بھی بڑھی ہیں اگر اس طرف توجہ نہ دی گئی تو ہماری صورت قرونِ وسطیٰ کی ایک آبادی کی مثال بن جائے گی اور اس خلا کو پر کرنا آگے چل کر دشوار ہو جائے گا۔ صرف اس سلسلے میں پیش رفت کے لیے صحافت کے شعبے قائم کر دینا یا ایم۔ اے کی اسناد تقسیم کر دینا کافی نہیں یا کسی فرد کا اشاعتی ادارے یا اخبار سے وابستہ ہو جانا مسئلے کا حل نہیں' اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے تاکہ مثبت اقدامات سے نتائج بھی برآمد ہو سکیں۔ آج کا عام قاری کیا سوچ رہا ہے' وہ کیا پڑھنا چاہتا ہے' وہ کس سطح سے حیات و کائنات کا جائزہ لینا چاہتا ہے' ان سوالات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس کے لیے ہمیں پرائمری کی سطح سے کالج اور یونی ورسٹیوں کے نصاب کو بھی از سرِ نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم جدید ترقی یافتہ قوموں کے ساتھ آگے بڑھ سکیں۔

افسانوی تحریروں کی طرح غیر افسانوی تحریریں بھی ذہنِ انسانی کو احساسِ مسرت اور فرحت سے ہم کنار کرتی ہیں۔ آج جو تقویت ان تحریروں سے حاصل ہوتی ہے وہ کسی ادیب اور شاعر کی تخلیق بھی نہیں بخش پاتی' اس لیے کہ یہ ٹھوس حقائق کے ساتھ ہماری بصیرت اور شعور میں اضافے کے ساتھ نتائج تک پہنچاتی ہیں اور مطمئن کرتی ہیں۔ ایک غیر افسانوی مصنف کے سامنے مخصوص علمی حلقہ یا صرف تعلیم یافتہ افراد نہیں ہوتے بلکہ اس کے قارئین کا حلقہ بہت زیادہ وسیع اور پھیلا ہوا ہوتا ہے' وہ یہ جانتا ہے کہ تحریر ہر ذہنی سطح کے افراد کے لیے لکھی جا رہی ہے وہ ہر شخص کو متوجہ کرتا ہے اور مختلف طبقوں میں اپنی تحریر سے یکساں مقبولیت حاصل کر جاتا ہے۔ اب یہ تحریریں کسی بھی پیداواری صنعت کی طرح مارکیٹ میں جاتی ہیں' مارکیٹ میں ان چیزوں کی کھپت ہوتی ہے جو خریداروں کی کشش اور دل چسپی کا سامان لیے ہوئے ہوں' اس لیے ان مصنفوں کو اپنی تحریروں میں ندرت اور حسن و آرائش کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ان مصنفین کا حال کسی بھی صنعتی ادارے میں ماہر کاریگروں کی طرح پیداوار میں اضافہ ہے۔ کیونکہ آج کل اشاعتی ادارے ان کی تحریروں کو

چھاپنے پر جو پیسہ لگاتے ہیں وہ ایک انوسٹمنٹ (INVESTMENT) تصور کیا جاتا ہے۔

مغربی ممالک میں اس رواج کی دیکھا دیکھی ہمارے یہاں بھی ان تحریروں کا ذوق و شوق بڑھ رہا ہے اور اب غیر افسانوی تحریریں زیادہ مطالعے کے لیے خریدی جاتی ہیں' یہاں میں علمی اور تحقیقی شعبوں کی نفی نہیں کر رہا یا ان کی اہمیت کو کم کرنا میرا مقصود نہیں بلکہ ایک عالمی ذہن اور رویے کی نشان دہی کر رہا ہوں' آپ اپنے ملک میں ہی موازنہ کر سکتے ہیں کہ کسی ادبی یا علمی رسالے کی اشاعت سے ڈائجسٹ یا اسی قسم کی کسی کتاب کی تعداد اشاعت کئی گناہ زیادہ ہوتی ہے۔

جہاں تک ان تحریروں کی قدر و قیمت کا تعلق ہے اس سلسلے میں یہ عرض کروں گا کہ اب عالمی ادب کے سرخیل بھی یہ بات تسلیم کرنے لگے ہیں کہ غیر افسانوی طرز پر لکھی جانے والی تحریریں صرف وقتی طور پر ہی قابلِ قدر نہیں بلکہ یہ اب علمی اور ادبی اعتبار سے بھی وقعت و اہمیت کی حامل ہو رہی ہیں اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان میں سے بیشتر تحریریں کلاسکس میں شمار ہونے لگی ہیں اور مستقل قدر و قیمت حاصل کر گئی ہیں۔ کچھ تصانیف تو ایسی ہیں جو ہمیشہ یادگار اور زندہ رہنے والی ہیں۔ ان تحریروں سے متعلق یہ بات کوئی حیران کن' تعجب خیز یا عجائبات عالم میں سے نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے آپ دنیا کا ادب اٹھا کر دیکھ لیجئے زیادہ تر کلاسیکل ادب، غیر افسانوی (NON-FICTION) پر مبنی ملے گا۔

ایشیائی ممالک میں ایک تو مطالعے کا رجحان ویسے ہی کم تھا اب فلم اور ٹیلی وژن نے مطالعے کے رجحان کو اور بھی کم کر دیا ہے اور افسانوی طرز تحریر (افسانہ' ناول' شعر و ادب) کو اور بھی دبا دیا ہے۔ اس کے برعکس غیر افسانوی تحریروں کی ضرورت برقرار رہی ہے' یہ تحریریں ان اثرات کے باوجود قاری کی دل چسپی کا مرکز اور حقائق و مشاہدات کی آگاہی اور مسرت کی ضامن بنی ہوئی ہیں۔ قاری جس دنیا میں زندہ ہے اور سانس لے رہا ہے' جن خواہشوں اور جذبوں کی تسکین کے لیے سرگرداں ہے وہ موضوعات' خیالات' وہ دنیا اور متعلقاتِ زندگی ان تحریروں میں اس کی وابستگی اور دلبستگی کے لیے موجود ہوتے ہیں اور اس نے تحریروں کے ذریعے بہتر انداز میں دنیا کا مشاہدہ اور متعلقات کا اندازہ کر لیا ہے کچھ نہیں تو متصور کر کے حقیقت تک پہنچ سکتا ہے' اب مسئلہ صرف جدید ترقی یافتہ سائنسی عہد اور ٹیکنالوجی کا نہیں بلکہ اب مسئلہ زندگی کی حقیقی اور واضح تصویر تک پہنچنے کا ہے۔

آج جب ٹیکنالوجی جو مشکل و پیچیدہ یعنی Various اور Complex شکل اختیار کرتی جا رہی ہے ہم اس کے انکشافات سے غیر افسانوی طرز تحریر اپنائے بغیر بہرہ ور نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اسے سمجھ سکتے ہیں۔ انسان کی اس تیز رفتار ترقی کے ساتھ ملکوں اور قوموں کے مسائل میں بھی الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں' ثقافتی اور تہذیبی انتشار سے ایک نئی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ آج انسانی بقا اور عالمی امن کے لیے بڑے توازن کی ضرورت ہے۔

غیر افسانوی طرز تحریر کے مصنفین پر ایک ادیب کے مقابلے میں زیادہ ذمہ داریاں ہیں' طاقت کا توازن' قوموں اور ملکوں کے درمیان برادرانہ رابطہ' مشینی دور میں جمہوریت کا برقرار رہنا یہ بڑے اہم اور بنیادی مسائل ہیں۔ آپ کی نظر سے اگر غیر افسانوی طرزِ تحریر کے مصنفین کی تخلیقات گذری ہیں تو آپ نے بخوبی اندازہ لگا لیا ہو گا کہ یہ مصنف اپنی تحریروں میں فنی اور تکنیکی باریکیوں سے بھی گزرتے ہیں اور ان تحریروں سے بہتر انسانی خدمت' فلاحی معاشرے

اور جمہوریت کے لیے جگہ بناتے ہیں اس لیے یہ اور بھی وقیع صورت اختیار کررہی ہیں۔

مصنف کو یہ معلوم ہے کہ مشینوں کو اگر شہنشاہیت بخش دی گئی تو انسان کی حیثیت کیا ہوگی، جدید ٹیکنالوجی سے لاعلمی کس قسم کی حکمرانی کا انداز اختیار کرے گی، آج ٹیکنالوجی کی برتری کی بنیاد پر کسی بھی خطے سے باقی ماندہ دنیا کو ذہنی اور جسمانی طور پر غلام بنانے کا اعلان کیا جاسکتا ہے اور انسانی آزادی کے پرچم جو صدیوں کی غلامی سے نجات کے بعد آہستہ آہستہ بلند ہوئے ہیں کسی بھی وقت انھیں سرنگوں کیا جاسکتا ہے۔ بقائے انسانی، امن اور جمہوریت ان مصنفین کے موضوعات کی بنیاد ہیں بلکہ وہ اس کا علم رکھتے ہیں اسی لیے اس علم سے فیضیاب کرتے ہیں۔

آج کی ترقی علم ہی کی طاقت کا نتیجہ ہے، آج علم ہی انسانی بقا کی ضمانت وضامن ہے۔ تاریخ شاہد ہے جہاں جہاں غلام قوموں کو علم حاصل ہوتا گیا ہے وہ اس علم کی بنیاد پر اپنے حقوق اور آزادی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے گئے ہیں، اس علم کی بنیاد کے سبب حاکم بھی جھکنے پر مجبور ہوئے ہیں، آزادی کا حصول اور اس کا برقرار رہنا دونوں کی بنیاد علم ہی ہے اگر اس کی کوشش ترک کردی جائے یا رفتار سست ہوجائے تو قومیں زیادہ علم رکھنے والوں سے مغلوب ہوجاتی ہیں اس لیے ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ علم کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آزادی کی حفاظت جب ہی ممکن ہے کہ جب قوم کا ہر فرد علم سے بہرہ ور ہونے کی کوشش کرے گا، تہذیب وثقافت کی زندگی علم سے ہے اور جمہوریت کے فروغ کی بھی یہی بنیاد ہے۔

غیر افسانوی طرزِ علم کا ایک کھلا راستہ ہے، جو ہمیں اپنی بقا اور ترقی کے لیے آواز دے رہا ہے۔ اس طرز کو اپنانے کے لیے ضروری نہیں کہ آپ کسی اخبار یا کسی ادارے سے وابستہ ہوں، یہ کام آپ آزاد رہ کر اور گھر بیٹھ کر بھی انجام دے سکتے ہیں، لیکن شرط لازم ہے کہ معلومات، مشاہدہ، تجربہ اور جدید علم سے آگاہی پورے طور پر ہو، آپ کے موضوع اور مواد میں قوت وجان اور خیال میں نیاپن ہو، آپ کی تحریر نئے علم پر ہو تاکہ قاری اس سے فیضیاب ہوسکے۔

ہمارے لکھنے والوں پر ہمیشہ یہ الزام رہا ہے کہ وہ صحیح رہنمائی نہیں کرتے وہ ہمیشہ قومی جذبات اور خواہشات سے کٹ کر سوچتے اور لکھتے ہیں جس کے سبب پسماندگی کا شکار رہے ہیں۔ جب علم انسان کی رہنمائی اور اس کے شعوری ارتقا میں ممد ومعاون نہ بن سکے تو انسانی ترقی اس کی فلاح اور بہتری کی کیا ضمانت دی جاسکتی ہے اسی لیے ہمارے یہاں جمہوریت اور انسانی آزادی کا تصور پنپ نہیں پاتا۔ حکمرانوں نے بھی اس کمزوری سے ہمیشہ فایدہ اٹھایا ہے۔

آج جمہوریت اور انسانی آزادی کی نوعیت مختلف ہے اس لیے وقت کی اہم ضرورت کے پیشِ نظر جدید ترین علوم سے آگاہی کے لیے فضا کو ہموار کرنے کے لیے شریک ہونا چاہیے اور ترقی یافتہ قوموں کے لائحہ عمل اور منصوبہ بندی کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور کم علمی کے اس اندھیرے کو علم کی روشنی سے منور کرنا چاہیے۔

غیر افسانوی طرزِ تحریر کے لیے ہمارے ملک میں فضا سازگار نہ سہی مگر سازگار ہوسکتی ہے۔ مغربی ممالک میں آج سے پہلے سازگار ماحول نہ تھا مگر اب صرف غیر افسانوی طرزِ تحریر کی مانگ ہے۔ فضا ہے تو صرف اس انداز کی تقلید کے لیے۔ یہ فضا ابھی اور زیادہ سازگار اور خوش گوار ہوگی انسانی علم جوں جوں آگے بڑھے گا، سائنس اور ٹیکنالوجی انسان کو انتہائی

ترقی کی طرف گامزن کرے گی۔ مسلسل معلومات، تحقیقات و انکشافات کے خزانوں سے انسان جتنا مالامال ہوتا جائے گا یہ طرزِ تحریر اتنا ہی ترقی کی منازل طے کرے گا۔

انسانی تلاش و جستجو کے طفیل اس بدلتی ہوئی دنیا پر ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب دنیا کے تبدیل شدہ حالات و ماحول سے مسائل کے حل میں پراسرار پیچیدگیاں اور مشکلات پیدا ہوں گی۔ اس وقت غیر افسانوی طرزِ تحریر کے مصنفین کی ذمہ داریوں میں اور بھی اضافہ ہوگا اور یہ مصنف اپنی قوتِ بصیرت اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر سے کام لے کر دنیا میں توازن اور ترقی کے راستے پر ایک وسیلہ اور رابطہ بن کر ابھریں گے، ہمیں اپنے آپ کو اس وقت کے لیے تیار کرنا چاہیے اور غیر افسانوی طرزِ تحریر کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر اسے اپنانے کی سعی کرنی چاہیے۔

اردو تنقید کا ارتقاء

از

ڈاکٹر عبادت بریلوی

نئے اضافوں کے ساتھ

تیسرا ایڈیشن

قیمت: پچاس روپے

غیر مجلد: پینتالیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی

مرزا ظفر الحسن مرحوم ۔ ایک باغ و بہار شخصیت

آمنہ مشفق

۹ستمبر کی صبح سات بجے کے قریب ٹیلی فون پر شاہین ظفر نے یہ افسوس ناک اطلاع دی کہ کچھ دیر ہوئی ان کے والد مرزا ظفر الحسن صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھے یہ احساس ہوا جیسے یہ اطلاع غلط ہو۔ بعض لوگ اتنے بھرپور طریقے سے زندگی بسر کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ موت کا تصور وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ مرزا صاحب بھی ان ہی لوگوں میں سے تھے۔ جو شخص زندگی بھر ہر لمحہ مضطرب اور بے قرار رہا ہو وہ دائمی طور پر پُرسکون کیسے ہوسکتا ہے؟ ابھی تین دن پہلے ہی تو مرزا صاحب سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ دیر تک اپنے مخصوص شگفتہ لہجے میں باتیں کرتے رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا تھا "آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟" میری مراد یہ تھی کہ ہسپتال سے یا گھر سے انہوں نے جواب دیا کیا تم سمجھ رہی ہو میں قبرستان سے بول رہا ہوں، میں نے کہا خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ پھر انہوں نے بتایا کہ انھیں ہسپتال سے رخصت کر دیا گیا ہے۔ اور وہ پہلے سے بہتر ہیں۔ یہ محض ان کی خوش فہمی تھی جس میں خود اعتمادی بھی شامل تھی۔ ورنہ ان کے قریبی لوگوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ داغِ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع کچھ دیر میں خاموش ہونے والی ہے۔

اپنی زندگی کے آخری آٹھ دس سال مرزا صاحب نے خوش فہمی اور خود اعتمادی کے سہارے گزارے تھے۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو مسلسل بیماری سے تنگ آکر حوصلہ ہار جاتا۔ مرزا صاحب ایک عرصے سے دل کے مریض تھے۔ کبھی کبھی تو بیماری تشویش ناک حد تک بڑھ جاتی تھی مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بیمار نہ سمجھا۔ اپنے تمام کام معمول کے مطابق کرتے رہے اور پھر وہ اچانک ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے جیسے یہ بھی معمول کے مطابق ایک کام ہو۔

مرزا صاحب میرے لیے گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتے تھے۔ غالب لائبریری چونکہ ہمارے مکان کے قریب ہی ہے اس لیے وہ اکثر ہمارے ہاں آتے رہتے تھے۔ وہ بڑے زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ محفل آرائی ان پر ختم تھی۔ ایسی مزے مزے کی باتیں کرتے تھے کہ جی چاہتا تھا کہ وہ بولتے ہی رہیں۔ چھیڑ چھاڑ۔ جملے بازی اور لطیفہ گوئی سے وہ محفل میں جان ڈال دیتے تھے لیکن اس طرح کہ اس میں تلخی یا دل آزاری کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ جس پر وہ جملہ کستے، وہی سب سے زیادہ محظوظ ہوتا۔

مرزا صاحب سے بے شمار ملاقاتوں کی یادیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں جنھیں پھر کبھی بیان کروں گی۔ اس وقت تو ان کی

آخری ملاقات بے حد یاد آرہی ہے۔ جب میں ۱۲ اگست کو ڈاکٹر وحید قریشی اور مشفق کے ساتھ مرزا صاحب سے جناح ہسپتال میں ملی تھی۔ انھیں میں نے تقریباً ڈھائی ماہ بعد دیکھا تھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بے حد کمزور نظر آرہے تھے۔ لیکن جب انھوں نے بات چیت کی تو محسوس ہوا کہ بیماری نے مرزا صاحب کی صرف ظاہری حالت کو متاثر کیا ہے، ان کی شگفتگیٔ طبع اور شگفتہ بیانی کا وہی عالم ہے۔ وہ بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہسپتال میں نہیں، اپنے گھر میں بیٹھے ہیں۔ ہم ان کے پاس کوئی ڈیڑھ گھنٹے بیٹھے انھوں نے بے شمار موضوعات پر گفتگو کی لیکن ایک مرتبہ بھی اپنی بیماری کا ذکر نہ کیا۔ اسی دوران میں ان کے معالج سید اسلم آگئے تو ان سے بھی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے ڈاکٹر سید اسلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "انھوں نے مجھ پر لکھنے پڑھنے کی پابندی لگا رکھی ہے" مشفق سے مرزا صاحب کی بے حد بے تکلفی تھی۔ انھوں نے مرزا صاحب کی بات سن کر ڈاکٹر صاحب سے کہا "مرزا صاحب پر لکھنے پڑھنے کی مکمل پابندی لگانے کی ضرورت نہیں، صرف فیضؔ پر کتابیں لکھنے کی ممانعت کافی ہے۔ پھر انشاء اللہ ان کی اور فیضؔ صاحب دونوں کی صحت اچھی رہے گی" اس پر مرزا صاحب نے قہقہہ لگایا اور کہا "ابھی تو مجھے فیضؔ صاحب کی سوانح عمری لکھنی ہے" فیضؔ صاحب کا ذکر چلا تو مرزا صاحب نے بتایا کہ ان کی صحت کے پیش نظر ڈاکٹروں نے سفر کرنے سے منع کیا تھا۔ لیکن جب فیضؔ صاحب کو حج کے ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے کہا کہ آپ ضرور حج کے لیے جائیں" مگر وہاں پہنچتے ہی مرزا صاحب پر دل کا شدید دورہ پڑا اور ڈاکٹروں کے مشورے پر وہ پاکستان واپس آگئے۔ انھیں اس بات کا غم تھا کہ وہ حج تک وہاں نہ ٹھہر سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اطمینان بھی تھا کہ صدق دل سے انھوں نے حج کا ارادہ کیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عین حج کے روز مرزا صاحب کا انتقال ہوا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انھیں حج کا ثواب ضرور ملے گا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ مرزا صاحب کے انتقال سے کراچی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا ایک اہم ستون گر گیا ہے۔ مرزا صاحب نے اس شہر کو ایک اہم ثقافتی مرکز بنانے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ انھوں نے فیض احمد فیضؔ اور دیگر ادیبوں کے ساتھ ۱۹۶۹ء میں ادارۂ یادگار غالب قائم کیا اور پھر اس ادارے کے تحت غالب لائبریری کی بنیاد رکھی۔ اس لائبریری کا قیام کراچی کی ادبی و ثقافتی زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ اس لائبریری کو ایک ادبی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جہاں آئے دن ادبی جلسے اور دیگر تقریبات ہوتی رہتی ہیں۔ اس لائبریری میں کوئی بھی فرد یا ادارہ ادبی جلسہ کر سکتا ہے اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔

مرزا صاحب نے غالب لائبریری کو بنانے، سنوارنے اور اس کے لیے کتابیں جمع کرنے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج اردو ادب کی حد تک یہ لائبریری نادر و نایاب کتابوں کا بہت بڑا خزانہ ہے۔ اس میں رسالوں کا جو ذخیرہ ہے وہ شاید ہی کسی دوسری لائبریری میں ہو۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کتابوں اور رسالوں کا بیشتر حصہ مرزا صاحب نے تحفتہً حاصل کیا ہے جس طرح سر سیدؔ علی گڑھ کالج کے لیے چندہ مانگا کرتے تھے اسی طرح مرزا صاحب لوگوں سے کتابیں مانگتے تھے۔ وہ کتابیں لینے کے لیے لوگوں کے گھروں پر جاتے تھے، خط لکھتے تھے، فون کرتے تھے۔ غرض کہ ان کے وقت کا بڑا حصہ اسی مصروفیت کی نذر ہو جاتا۔ انھیں شدید بیماری کے دوران بھی لائبریری کا خیال رہتا تھا۔ وہ عیادت کے لیے آنے والوں سے کہتے "میری عیادت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ جب آئیں تو غالب لائبریری کے لیے دو چار کتابیں ضرور لیتے آئیں۔ اس سے میں جلد صحت یاب ہو جاؤں گا"

مرزا صاحب ۳ر جون ۱۹۱۶ء کو حیدرآباد دکن میں بہ مقام سنگا ریڈی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سنگاریڈی میں اور اعلیٰ

تعلیم حیدر آباد میں حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ میں وہ مخدوم محی الدین اور سکندر علی وجد کے ساتھیوں میں سے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی وجہ سے نام پیدا کیا۔ انھیں انجمن اتحاد طلبہ جامعہ عثمانیہ کا صدر منتخب کیا گیا جو ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اسی زمانے میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ انھوں نے ایک افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "محبت کی چھاؤں"، کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کے کئی ڈرامے اسٹیج بھی کیے جا چکے ہیں۔ مرزا صاحب نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی خاصی تعداد میں لکھے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔

مرزا صاحب کا اصل ادبی کارنامہ وہ تین کتابیں ہیں جو حیدر آباد دکن کی یادوں پر مشتمل ہیں۔ پہلے انھوں نے "ذکر یار چلے"، اس کے بعد "پھر نظر میں پھول مہکے"، اور آخر میں "دکن اداس ہے یارو"، لکھی۔ یہ تینوں کتابیں اپنے اسلوبِ بیان اور موضوع کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ مرزا صاحب نے حیدر آباد دکن سے اپنی یادوں کو اتنی خوب صورتی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ ان کتابوں میں سقوطِ حیدر آباد سے پہلے کے ۲۵۔ ۳۰ برسوں کی تہذیبی، سماجی اور ادبی زندگی کے بارے میں بیش بہا معلومات ملتی ہیں۔ کئی اہم اور معروف شخصیات کو ہمیں قریب سے جاننے کا موقع ملتا ہے۔ ان کتابوں میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی اور شخصی خاکہ نگاری کے بھی بہترین نمونے ملتے ہیں۔

حیدر آباد دکن کے بعد مرزا صاحب کا محبوب ترین موضوع فیض احمد فیض تھے۔ فیض سے ان کا عشق مثالی تھا۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ خود فیض پر قابلِ قدر کام کیا بلکہ دوسروں کو بھی کام کرنے پر آمادہ کیا۔ اور اس طرح فیض شناسی کے لیے فضا پیدا کی۔ مرزا صاحب نے فیض پر جو کتابیں لکھیں یا مرتب کی ہیں وہ یہ ہیں: (۱) صلیبیں مرے دریچے میں۔ (۲) متاعِ لوح و قلم۔ (۳) عمرِ گزشتہ کی کتاب۔

(۴) قرضِ دوستاں (۵) خونِ دل کی کشید۔

فیض نے زمانۂ اسیری میں اپنی بیگم کو جو خط لکھے تھے وہ بیگم فیض کے پاس محفوظ تھے۔ یہ خط فیض کی شخصیت، فن اور حالات زندگی کو جاننے کے سلسلے میں نہایت کارآمد دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مرزا صاحب نے فیض صاحب سے تقاضے کر کر کے انھیں انگریزی سے اردو میں منتقل کرایا اور پھر اپنے حواشی کے ساتھ مرتب کیا۔ یہ مجموعہ "صلیبیں مرے دریچے میں"، کے نام سے شائع ہوا۔

"متاعِ لوح و قلم"، میں فیض کی منتشر تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے۔ یہ وہ تحریریں ہیں جو فیض نے ادبی و غیر ادبی موضوعات پر وقتاً فوقتاً لکھیں اور پھر طاقِ نسیاں کی زینت بن گئیں۔ مرزا صاحب نے انھیں بڑی تلاش اور محنت سے جمع کیا۔ اس کتاب میں فیض کی نثر کے بعض اچھے نمونے ملتے ہیں۔

"عمرِ گزشتہ کی کتاب"، میں مرزا صاحب نے فیض اور مخدوم محی الدین کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور اس طرح دونوں کے بارے میں بہت سی نادر معلومات جمع کر دی ہیں۔

"قرضِ دوستاں"، میں مرزا صاحب نے فیض کے دیباچوں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ یہ وہ دیباچے ہیں جو فیض نے دوسروں کی کتابوں پر لکھے تھے ۱۹۷۶ء میں مرزا صاحب نے رسالہ "غالب"، کا فیض نمبر شائع کیا تھا جس میں فیض پر ممتاز اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں مرزا صاحب نے اس نمبر کو ترامیم اور اضافوں کے ساتھ "خونِ دل کی کشید"، کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔

مطالعہ فیض کے سلسلے میں مرزا صاحب کی کتابیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ فیض کا کوئی طالب علم ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ مرزا صاحب نے فیض کے بارے میں متعدد مضامین بھی لکھے جو ابھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے اسی طرح ایک کتاب "فیض سوئے دار چلے" بھی غیر مطبوعہ ہے اس میں فیض کے حوالے سے راولپنڈی سازش کیس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ مرزا صاحب فیض کی سوانح عمری بھی لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے بہت سا بنیادی کام بھی کر لیا تھا۔ لیکن فیض کے مسلسل ملک سے باہر رہنے کی وجہ سے یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ مرزا صاحب نے فیض پر جتنا اور جیسا کام کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فیض صاحب خوش قسمت ہیں کہ انہیں مرزا ظفر الحسن جیسا عقیدت مند ملا۔

مرزا صاحب کے دیگر ادبی کاموں میں "یاد یار مہرباں" بھی قابلِ ذکر کتاب ہے۔ یہ ذوالفقار علی بخاری کے بارے میں مختلف اہلِ قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ بخاری مرحوم پر یہ پہلی اور واحد کتاب ہے جو منظر عام پر آئی ہے۔ مرزا صاحب نے ۱۹۷۸ء میں حیدر آباد دکن کا سفر کیا تھا اس سفر کی یادوں کو بھی انھوں نے سفرناموں کی صورت میں محفوظ کیا ہے۔ یہ سفرنامہ تاحال شائع نہیں ہوا۔ مرزا صاحب نے ڈراموں، شخصی خاکوں اور دیگر مضامین کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے جس سے کم از کم چار مجموعے مرتب کیے جا سکتے ہیں۔

مرزا صاحب نے جو ادبی کام کیے ہیں وہ ان کے نام کو اُردو ادب کی تاریخ میں زندہ رکھیں گے۔ اور پھر ہمارے شہر میں غالب لائبریری موجود ہے جو مرزا صاحب کی بہترین یادگار ہے اور جسے قائم رکھنا ہمارا فرض ہے۔

دسویں صدی ہجری کی

ادبی روایات کا سراغ

دیوانِ حسن شوقی

مرتبہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ کراچی

ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی یاد میں

محمد محی الدین بدایونی

قادری آہ انتقال نمود! اس مصرع سے عہد اکبری کے نامور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی کا سن وفات نکلتا ہے۔ قادری ان کا تخلص تھا۔ قطعۂ تاریخ حسین قلی خان شیفتہ اصفہانی نے نظم کیا تھا۔ یہ مصرع اضطراری طور پر میری زبان پر آگیا جب ۲۶ نومبر ۱۹۸۳ء کی صبح کے اخبار نظر سے گزرے۔ لیکن اس کا محرک ملا عبدالقادر کی ذات نہیں بلکہ میرے عزیز دوست پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری تھے۔ اخباروں کے سرورق پر یہ جاں گداز خبر تھی کہ مشہور محقق اور دانشور ڈاکٹر محمد ایوب قادری کل ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہوش گم ہو گئے کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ دل شکوہ سنج ہوا کہ الہٰی یہ بے ہنگام المیہ بھی ہمارے نصیبوں میں لکھا تھا۔

یہ تمہید مجھے ایوب قادری سے اپنی ایک ملاقات کی یاد دلاتی ہے۔ ۱۹۷۹ء کی گرمیوں کا کوئی دن تھا۔ باتوں باتوں میں ان سے میں نے پوچھا کیا ملا عبدالقادر کی سوانح عمری بھی کسی نے مرتب کی ہے، اور اگر اسے ترتیب دیا جائے تو ضروری مواخذات کیا ہوں گے؟ انھوں نے برجستہ کہا کہ ملا کی سوانح حیات خود ان کی تصنیف "منتخب التواریخ" سے جزوی اخذ کی جا سکتی ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی کے اہم واقعات اور اپنے تجربات کا تذکرہ اس میں جگہ جگہ تفصیل سے کر گئے ہیں۔ پھر کتابوں کی الماری سے ایک رجسٹر نکال لائے۔ ایک دو جگہ سے اسے پڑھ کر سنایا۔ اس رجسٹر میں "منتخب التواریخ" سے ملا کی ذات سے متعلق اقتباسات تھے جو انھوں نے درج کر رکھے تھے۔ میں نے دریافت کیا یہ سودہ کب مرتب کیا۔ بولے جب وہ بدایوں میں قصبہ اوجھیانی میں مقیم تھے۔ میں نے کہا وہ تو کم و بیش ان کے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ اس وقت یہ مشکل کام انھوں نے کیوں کر انجام دیا۔ بولے۔ "بال بس ہو گیا۔"

دراصل علم ان کی گھٹی میں پڑا تھا اور تصنیف و تالیف کا روگ انھیں بچپن ہی سے لگ گیا تھا۔ وہ بے شک پیدائشی عالم تھے۔ ۲۸ جولائی ۱۹۲۶ء کو جب ضلع بریلی کے تاریخی قصبے آنولہ میں وہ پیدا ہوئے اس وقت وہاں کے عالم اور بزرگ مولوی حکیم عبدالغفور نے ان کے کان میں اذان دی۔ انھیں بزرگ نے ان کی تاریخ پیدائش "چراغ علم" سے نکالی۔ افسوس یہ چراغ ستاون سال روشن رہ کر دفعتاً گل ہو گیا۔

مرحوم کی شکل آنکھوں میں پھرتی ہے اور آواز کانوں میں گونجتی ہے گو عمر ۵۷ سال تھی لیکن چہرے مہرے اور چال ڈھال سے پینتالیس[45] سے کچھ ہی اوپر معلوم ہوتے تھے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ان میں کسی نمایاں تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وقت کی لگام کو انھوں نے مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ درمیانہ قد کسی قدر درازی مائل، گندمی رنگ، متناسب ناک نقشہ، دوہرا جسم، لباس سادہ اور ستھرا۔ آواز میں کھنکار، گفتار میں زیر لب غیر ارادی ہلکا سا تبسم۔ شرافت کا پیکر، چال تصنع سے پاک مگر وہ اس وقار سے چلتے جیسے کشاں کشاں اپنی منزل کی طرف جا رہے ہوں۔ جو لفظ بولتے جچا تلا ہوتا۔ ان کی ہر بات ان کی خود اعتمادی پر دلالت کرتی۔ وہ اپنے سامعین کے دل میں یک گونہ اعتبار پیدا کرتے تھے۔ ہمیشہ چاق و چوبند انتہائی مستعد اور محنتی۔ نہ دن دیکھتے نہ رات، نہ سردی نہ گرمی، نہ بارش نہ آندھی۔ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتے اور اپنی دھن میں مگن رہتے۔ ان کی قوت ارادی بے پناہ تھی۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتے

پورا کر دکھاتے، چاہے کتنی دشواریاں راہ میں حائل ہوتیں۔ علمی کام کے تو وہ تہجد گذاروں میں تھے۔ جب گھر میں ناشتہ تیار ہوتا تو وہ اپنا دن بھر کا کام پورا کر چکے ہوتے تھے۔ دن تدریس، مطالعہ اور ملاقاتوں کے لیے وقف ہوتا وہ بڑے سیلانی تھے۔ احباب سے ملاقات کے لئے ہمیشہ آتش بہ زیر پا رہتے۔ بقول غالب ع

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

اسی دھن میں کراچی کے لمبے لمبے ظالم فاصلے وہ خندہ پیشانی سے طے کرتے تھے یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ نہ کبھی سواری نہ ملنے کی شکایت کی نہ وقت کی تنگی کی۔

ان کی تقریریں تحقیقی اعتبار سے اپنے موضوع پر حاوی ہوتی تھیں۔ وہ جو کچھ کہتے مدلل کہتے، برجستہ کہتے، برملا کہتے، برمحل کہتے۔ ہر چند کہ ان میں جوش خطیبانہ نہیں تھا لیکن ان کا لفظ لفظ دل میں اترجاتا تھا، اسی طرح جیسے کلاس روم میں کوئی لائق استاد لکچر دے رہا ہو۔ علمی اور تاریخی دیانت داری ان کا طرہ امتیاز تھی اپنا مطلب وہ اتنے وثوق اور طمانیت سے بیان کرتے کہ سامعین حظ اٹھاتے۔ ان کی تحریر کی طرح ان کی تقریر میں بھی کہیں جھول نہیں ہوتی انھوں نے پاکستان اور ہندوستان کی متعدد اعلیٰ سطحی کانفرنسوں میں شرکت کی اور ہر موقع پر اپنی تحریر و تقریر کا لوہا منوایا۔ مشاہیر کے گروہ میں وہ ہمیشہ فخر کی نگاہ سے دیکھے گئے اور ہمیشہ سربلند رہے۔

وہ سید الطاف علی بریلوی کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ربع صدی سے اوپر ان کی رفاقت رہی۔ اس کا مختصر حال خود سید صاحب کی زبانی سنیئے "میں پروفیسر قادری کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۴۷ء میں دیکھا تھا جب کہ پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس آنولہ ضلع بریلی میں مولانا حسرت موہانی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ محمد ایوب قادری اس وقت ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ انہوں نے جلسہ گاہ سے متصل اپنی کتابوں کی نمائش ایک دوکان میں لگائی تھی اور مجھے بطور خاص دکھانے لے گئے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان آنے کے بعد دوبارہ ملاقات ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ایوب قادری میں علمی جذبہ لگن اور تجسس کا مادہ موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے میرے بتائے ہوئے موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔ اور ان کے تحقیقی مقالوں کی ملک میں دھوم مچ گئی۔ میری یہ عادت رہی ہے کہ ذہین اور طباع نوجوانوں کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایوب قادری کو قدرت نے ایک جوہر قابل بنایا تھا چنانچہ وہ آہستہ آہستہ اپنا میدان خود تلاش کرنے لگے۔ میری ناچیز گزارش پر ڈاکٹر معین الحق صاحب، سیکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے ایوب قادری صاحب کو اپنے اسٹاف میں بطور ریسرچ اسکالر شامل کرلیا یہاں ان کے مزید جوہر کھلنا شروع ہوئے۔"

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے مولوی رحمان علی صاحب کی فارسی کتاب "تذکرۂ علمائے ہند" کا اردو ترجمہ جب ایوب قادری کے نام سے شائع ہوا تو دانشوروں کی نگاہیں ان پر پڑیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ادبی اور علمی افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا۔ یہ ترجمہ مقبول ہوا اور اس نے سند کی صورت اختیار کرلی۔ ممتاز مصنفین اپنے مضامین میں اس اردو ترجمے کا حوالہ بڑے وثوق سے دیتے ہیں۔ پھر صمصام الدولہ شاہ نواز خان کی ضخیم اور مشہور عالم تصنیف "ماثر الامرا" کا اردو ترجمہ مع حواشی کے انھوں نے مرکزی اردو بورڈ سے تین جلدوں میں شایع کرایا۔ اس ترجمہ نے دھوم مچادی۔ اگر ایوب قادری اس کے علاوہ کوئی اور ادبی کارنامہ نہ بھی انجام دیتے تو یہ قدیم فارسی سے جدید اردو میں ان کا ترجمہ تحقیق، تاریخ اور تصنیف کی دنیا میں انھیں شہرت دوام دینے کے لئے کافی تھا اس سے پہلے اسی قبیل کی ایک تصنیف "وقائع عبد القادر خانی" کا اردو ترجمہ دو جلدوں میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے شائع کیا۔ یہاں بھی ایوب قادری کے حواشی قابل ستائش ہیں۔ دراصل حاشیہ نگاری ان کا طرہ امتیاز تھی۔ جہاں قابل مصنف کچھ چھوڑ گیا یا اس سے کوئی شک یا سہو ہوا۔ ایوب قادری حاشیہ میں اس کمی کو بطریق احسن پورا کردیتے تھے۔

ایوب قادری نے تحقیق کے میدان میں بڑا دور رس ذہن پایا تھا تاریخی واقعات اور رجال کو پرکھنے کا جیا ملکہ انھیں تھا اب وہ کم دیکھنے میں آتا ہے مستند حوالے وہ کہاں کہاں سے فراہم کرتے تھے اس کی داد دینا مشکل ہے۔ ۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ پروفیسر ضیا احمد مرحوم کے ایما پر انھوں

نے تذکرہ شعرائے بدایوں" ترتیب دینا شروع کیا۔ ایک دن اس موضوع پر میں مولوی سبطین احمد مرحوم سے بات کر رہا تھا۔ میں نے کہا کہ اتنا زمانہ گزر چکا، انقلاب آیا، ذاتی کتب خانے اور غیر مطبوعہ دیوان تباہ ہو چکے۔ ان حالات میں یہ ناممکن سا کام نظر آتا ہے۔ سبطین صاحب نے بڑے وثوق سے کہا کہ ایوب قادری اسے کرلیں گے اور پھر وہ بولے "وہ بڑے کھوجو ہیں" "کھوجو" ایوب قادری کے جذبہ تحقیق کی صحیح صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اس تذکرے کے سلسلے میں وہ بدایوں بھی گئے اور بہت کچھ مال غنیمت ساتھ لائے۔ بالآخر تذکرہ انھوں نے مکمل کر ہی لیا۔ میں نے تو ان کے تجسس اور جاں فشانی پر عش عش کیا۔

معلومات کا وہ جیتا جاگتا کمپیوٹر تھے۔ ادھر سوال کیجیے ادھر جواب پایئے۔ چند مثالیں حاضر ہیں۔

(۱) ایک بار مجھے ملا عبدالقادر کے سلام کی ضرورت پیش آئی۔ اس سلام کا مصرعِ اول ہے ؎

اے صبا! از من ببر اہلِ براون را سلام

اس میں بدایوں کے قدیم خاندانوں کا تذکرہ طنز و توصیف کے ساتھ ملا نے فارسی میں بڑے دلچسپ پیرایے میں نظم کیا ہے۔ اور یہ سلام اب نایاب ہے۔ ایوب قادری سے بات کی۔ دوسرے ہی دن یہ سلام انھوں نے ضروری حواشی کے ساتھ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیج دیا۔

(۲) ۱۹۲۰ء میں تقسیم ہند کا تصور مع جذبات کے بدایوں کے اخبار ذوالقرنین میں شایع ہوا تھا۔ شریف الدین پیرزادہ نے اپنی تصنیف EVOLUTION OF PAKISTAN میں یہ تاثر دیا ہے کہ یہ منصوبہ گمنام تھا۔ میرے علم میں تھا کہ اس کے مصنف عبدالقدیر بلگرامی تھے۔ ایوب قادری سے میں نے وضاحت چاہی۔ انھوں نے برجستہ کہا کہ وہ اس مسئلے پر ضروری تحقیق کر چکے ہیں۔ دراصل یہ منصوبہ قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی نے بنایا تھا۔ وہ اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ اس لیے اپنے نام سے شایع نہیں کرا سکتے تھے۔ عبدالقدیر بلگرامی ان کے بھائی تھے اور سرکاری بندش سے آزاد۔ یہ منصوبہ انھوں نے اپنا کر اپنے نام سے شایع کیا اور اصل مصنف گمنام ہی رہا۔ اسی وجہ سے پیرزادہ نے اسے گمنام تصور کیا ہے۔

(۳) ایک بار میں سید محفوظ علی مرحوم کے ایک مضمون کا جائزہ لے رہا تھا۔ سید صاحب نے اس مضمون میں چند سیاسی اکابر اور مشہور زمانہ اخبارات کا تذکرہ اپنے مخصوص چیستانی انداز میں کیا ہے۔ ان کی رمز یہ تحریر کا حل میں نے نکال لیا۔ بس ایک جگہ اٹک گیا۔ سید صاحب کی پہیلی تھی۔ "سابق آنریبل وصال حاجی جاں نثار خاں مدیر، جو نام کے اعتبار سے ابراہیم صاحب کے خلف ہیں، اور جو مرغیوں کی سوانح عمری لکھتے ہیں اور وفاداری پر مضمون چھاپتے ہیں۔" ایوب قادری نے چھان بین کر کے بتایا کہ یہاں مراد ہیں حاجی نواب اسمٰعیل خاں شروانی رئیس دتاولی، علی گڑھ تحریک کے حامی و مددگار، کچھ عرصے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مدیر رہے۔ معارف، افادہ اور العزیز پرچے نکالے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں "تربیت الدجاج" خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جس کی طرف اشارہ "مرغیوں کی سوانح عمری" کیا گیا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں آگرہ میں انتقال ہوا۔

تحقیق کے میدان میں انھیں خدا نے بڑا رسا ذہن عطا کیا تھا۔ ایک بار بدایوں میں مولوی محمد سلیمان مرحوم کے ہاں محفل جمی تھی۔ بات یہ نکلی کہ جب کوئی شخص یا ملازم کسی کام سے جاتا ہے اور جلد واپس نہیں آتا تو بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں ــــ "وہ اوچھ گیا"۔ سوال یہ تھا کہ اس گھریلو محاورہ کی وجہ کیا ہے۔ ایوب قادری بولے کہ بدایوں کی طرح اوچھ بھی بزرگان دین کا مرکز رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل بدایوں کا آنا جانا اوچھ تھا اور جو وہاں جاتا وہ فاصلہ اور رسوماتِ زیارت کی طوالت کے باعث زیادہ دیر ہی میں واپس آتا تھا اور جب واپس آتا تھا تو اگر کوئی پوچھتا کہ بڑے دنوں بعد نظر آئے تو معاً کہہ دیا جاتا "ہم اوچھ گئے تھے"۔ یہ دیری ضرب المثل بن گئی۔ یہ بات ذہن نے قبول کی۔ میں نے عرض کیا کہ "مر ملتان گئے" بھی اسی قبیل کا مقامی محاورہ معلوم ہوتا ہے۔

ایوب قادری نے اپنی زندگی کے آخری سال بڑے کرب میں گزارے۔ پہلے ان کا جوان بیٹا زبیر ناگہانی طور پر اللہ کو پیارا ہوا پھر ان کے حقیقی بھائی نعمت اللہ قادری حادثے میں جاں بحق ہوئے وہ کتنے دلگیر تھے اس کا اندازہ ان کی کتاب "کاروانِ رفتہ" کے سرآغاز سے ہوتا ہے۔ تحریر فرمایا

"اس کتاب کی اشاعت کے موقع پر مجھے اپنے چھوٹے بھائی محمد نعمت اللہ قادری مرحوم کی یاد بے چین اور بے قرار کئے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے"۔

واقعات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جب یہ کتاب چھاپے خانے سے باہر آئی تو خود جانِ بار محمد ایوب قادری "کاروانِ رفتہ" میں شامل ہو چکے تھے۔ انھوں نے بھائی کی سنت ادا کی اور ان کی طرح ٹریفک کے حادثے کا ہی شکار ہوئے۔

ایوب قادری آخری دم تک فعال رہے۔ جب موت ان کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ اس دن انھوں نے غسل کیا دھلے کپڑے پہنے۔ نماز جمعہ ادا کی، کھانا کھایا اور دوستوں سے ملاقات کو باہر نکلے۔ کہتے ہیں ایک سفید رنگ کی گاڑی نے انھیں ہلاک کیا اور وہ فرار ہوگئی۔ کوئی نمبر بھی نوٹ نہ کر سکا بھلا موت کے فرشتے کا بھی کوئی نمبر ہوتا ہے!۔

اپنی کتاب "غالب اور عصر غالب" مجھے اس تحریر کے ساتھ بھیجی۔

"۱۹ اگست ۸۳ء

محترمی سلام علیکم

باوجود دلی خواہش اور ارادے کے آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اپنی کتاب خدمت میں بھیج رہا ہوں رائے اور رسید سے مطلع فرمایئے۔

میں نے وحید احمد (شیخو پورہ) پر ایک مضمون لکھا ہے جی چاہتا ہے کہ اشاعت سے پہلے آپ ایک بار پڑھ لیں کیا صورت اختیار کی جائے۔

فقط والسلام

محمد ایوب قادری"

اس تحریر پر مناسب کارروائی ہوئی۔ متعلقہ مضمون سہ ماہی "اردو" میں اشاعت پذیر ہوا لیکن ہیہات اک آخری ملاقات کی تمنا دل کی دل میں ہی رہی۔ اور ایوب قادری دفعتاً داغِ مفارقت دے گئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی بیکراں نعمتوں سے نوازے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ ایسے انسان اور ایسے ادیب روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کی کتابیں علامہ شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا غلام رسول مہر کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔ وہی تحقیق کی گہرائی، وہی تاریخ پر کامل عبور، وہی اسلوب و بیان کا ستھرا پن، اور ویسی ہی موضوع پر گرفت۔

مشاہیر کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں وہ بڑے اہتمام سے رکھتے تھے اور اکثر قطع تاریخ بھی نظم کر دیتے تھے۔ سال کے شروع میں گزشتہ سال کے گزرے ہوؤں کا گوشوارہ وہ اخبار میں شایع کر دیتے تھے لیکن وہ "سن ۸۳ء میں جدا ہو گئے ہم سے یہ لوگ" شایع نہ کر سکے کیوں کہ کچھ ہی دن پہلے خود وہ اس گوشوارہ کا حصہ بن چکے تھے۔

وفاقی اردو کالج سے ان کا دیرینہ تعلق تھا۔ اس کالج کے مجلہ "برگ گل" کی ترتیب اور تدوین میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ بڑے جتن سے مضامین فراہم کرتے تھے۔ اس کا اندازہ مجلہ کے ان ضخیم شماروں سے ہوتا ہے جو مولانا محمد علی جوہر، قائداعظم محمد علی جناح، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اور نواب

بہادر یار جنگ کے بارے میں کالج سے شایع ہوئے۔

ان کی تالیفات، تصنیفات اور دیگر نگارشات کی فہرست طویل ہے۔ یہاں ان کے ساتھ انصاف کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس قدر عرض کرتا چلوں کہ وہ اپنی ہر کتاب میں کوئی نہ کوئی نئی یا پرانی تحقیقی بات جو بالعموم آنکھوں سے اوجھل ہوتی شامل کر دیتے تھے۔ مثلاً "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" میں ان کا تحقیقی مقالہ "قدم شریف" چونکا دینے والا ہے۔ جیسے "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" میں مولوی رضی الدین بدایونی کی نگارشات جو دہلی کے چشم دید واقعات پر مشتمل ہیں شامل کر دیں۔ یہ ایک اہم دستاویز ہے۔

ایوب قادری مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی بحث تکرار سے پاک ہوتی تھی۔ اور وہ معاملات اور شخصیات کو محض مورخ اور محقق کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اشتیاق اظہر نے ان کی اس خوبی کا تذکرہ بہت خوب کیا ہے وہ لکھتے ہیں "انھیں جنوبی ایشیا کے تمام مکاتیب فکر کے لوگوں تک رسائی ہی حاصل نہیں رہی بلکہ اس علاقے کے ہر مکتبۂ فکر کے افراد انھیں اپنے حلقہ ہی کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ وہ دیوبندیوں میں دیوبندی، بریلویوں میں بریلوی اور دانش گاہ ندوہ کے حوالے سے ندوی سمجھے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ تحریک اسلامی کے اکابر بھی انھیں عزیز رکھتے تھے۔ دراصل ان کے دل و دماغ کا کینوس اتنا وسیع تھا کہ اس میں ہر حلقے کے نقش و نگار کی بہتات ملتی تھی۔"

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے مورخ تھے۔ اور مورخ ہر شخص اور واقعہ کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ عقائد کی بنیاد پر نہیں وہ خود ایک سیدھے سچے مسلمان تھے۔ ضعیف الاعتقادی سے دور اور بدعتوں سے پاک۔

ایوب قادری کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا۔ سخی حسن کے قبرستان میں وہ پیوند خاک ہوئے یہ ان کی رہائش گاہ سے قریب ہی ہے لیکن بقول قمر جلالوی

حالانکہ گھر سے تربت کچھ دور تھی نہ ایسی
پہنچا مگر جنازہ کاندھے بدل بدل کر

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں سے انہیں والہانہ لگاؤ تھا۔ یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ جب ایوب قادری کے آخری دیدار میت پر شورِ ماتم اٹھا، اس وقت ڈاکٹر صاحب کے آنسو اور صبر آزما آہیں شامل حال تھیں۔ انھوں نے انھیں کاندھا بھی دیا اور مٹی بھی۔ بڑی تعداد میں اساتذہ طلبا، ادبا، اور صحافی موجود تھے۔ فضا رحمتِ الٰہی سے بوجھل بوجھل لگتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایوب قادری زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں جو کام کرنا ہے جلدی سے کر لو۔ بلکہ فوری کر لو کیونکہ پل کی خبر نہیں۔ جب انہیں قبر میں اتارا تو یہ رباعی یاد آ رہی تھی۔

گل صبح دم از باد بر آشفت و بریخت
با باد صبا حکایتے گفت و بریخت
بد عہدی عمر بیں کہ گل در دہ روز
سر برزد و غنچہ کرد و بشگفت و بریخت

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور رہتی دنیا تک ان کے کارناموں کو زندہ رکھے۔ آمین ثم آمین۔

غلام عبّاس - ایک مطالعہ

شفیق احمد شفیق

غلام عباس نے طالسطائی کے ایک افسانے کے مرکزی خیال کی بنیاد پر ۱۹۲۵ء میں پہلا افسانہ "جلاوطن" لکھا اور فکشن کی مملکت میں داخل ہوگئے لیکن اس مملکت کی باقاعدہ شہریت کا آغاز ۱۹۳۳ء میں یعنی آٹھ برس بعد انھیں اس وقت ملی جب انھوں نے پہلا طبعزاد افسانہ "مجسمہ" لکھا۔ غیر معمولی تخلیقی صلاحیت اور مستقل مزاجی نے انھیں بعد کو اس مملکت کی شہریاری بھی دلادی۔ ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا خصوصاً روسی، انگریزی اور فرانسیسی ادب سے انھیں بڑی رغبت تھی۔ اور ان زبانوں کی شاعری اور فکشن پر ان کی نظر بڑی گہری تھی یہی وجہ تھی کہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک یورپی ادبیات کا ترجمہ بڑی سنجیدگی سے کرتے رہے۔ اس اعتبار سے وہ پہلے مترجم ہیں بعد میں تخلیقی افسانہ نگار۔ لیکن ان کے اندر ایک بڑا فن کار چھپا ہوا تھا جس نے آٹھ نو سال کے اندر مترجم غلام عباس کو پوری طرح مسخ کرلیا۔ اس کے چھ سال بعد تخلیقی صلاحیت رکھنے والے غلام عباس نے "آنندی" جیسی کہانی ۱۹۳۹ء میں لکھی جو اردو ادب کی ایک لازوال، منفرد، تاریخ ساز اور خوبصورت تخلیق ثابت ہوئی۔ خود غلام عباس نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ "میری شہرت کی بنیاد آنندی سے استوار ہوئی جسے میں نے ۱۹۳۹ء میں لکھا تھا۔ ادب میں مجھے اسی افسانے سے Recognise کیا گیا۔" انھوں نے یہ بات اپنی موت سے ۲۷ دن کم ایک سال پہلے کہی تھی۔

غلام عباس یوں تو چیخوف اور موپاساں سے بھی متاثر نظر آتے ہیں لیکن ان کے فن کا اصل رنگ روپ جو واضح طور پر ان کی کہانیوں میں نظر آتا ہے وہ طالسطائی اور پریم چند کے فکر و فن سے بڑی حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ ان کے یہاں طالسطائی اور پریم چند کی طرح زندگی کی خارجی اور حقیقی صداقتیں ادب و فن کی شائستہ اور حسین روایتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ طالسطائی اور پریم چند کے اثرات کے علاوہ ترقی پسند تحریک اور ملکی و غیر ملکی حالات نے بھی انھیں سماجی، معاشی اور تہذیبی قدروں کو اپنے اندر جذب کرنے پر مجبور کیا اس لیے کہ ایک حساس اور پختہ شعور رکھنے والا ادیب اپنے عہد سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ غلام عباس ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے ان کی پیدائش سے پہلے ہی برصغیر میں بے چینی کی لہر ہر دل میں اٹھ رہی تھی۔ پریم چند کے زمانے میں جس عوامی، سیاسی اور اقتصادی بے چینی کی لہر ہر دل میں اٹھ رہی تھی اس نے ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کرلی اور غلام عباس کی جوانی کے ساتھ ہی یہ تحریک بھی جوان ہوگئی۔

غلام عباس غالباً چھبیس ستائس سال کے ہوں گے جب پوری دنیا میں فکری و سیاسی انقلابات تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔ سرمایہ داری کی حویلی کساد بازاری کے عفریت میں گھری ہوئی تھی۔ سامراجیت اپنے وجود کے تحفظ کے لیے فاشزم کے ظالمانہ

اور غیر جمہوری نظام کو تقویت پہنچانے کی سعی میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھی۔ خصوصاً اٹلی اور جرمنی میں اس کی نام نہاد سرخروئی اور کامرانی کے لیے زمین ہموار ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت بھی ایک ناقابلِ تسخیر عالمی قوت بن کر اپنا اثر و نفوذ پوری دنیا میں قایم کرنے کی کوشش میں منہمک تھی۔ چونکہ برطانوی حکومت خود سرمایہ دار اور سامراجی قوتوں میں سے ایک تھی لہٰذا برصغیر میں بھی انگریزوں کے خلاف نفرت شدید تر ہو گئی۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء تک برطانوی اقتدار کے خلاف نفرت اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ اس وقت برصغیر میں دو نمایاں قسم کے رجحانات بڑی مضبوطی کے ساتھ عوام کے ذہنوں میں جڑ پکڑ رہے تھے۔ ایک رجحان ہندوستانی قوم پرستی کا علمبردار تھا اور دوسرا سوشلزم کا نقیب مگر ان دونوں محرکات کی پہلی منزل ایک ہی تھی یعنی کسی طرح سے برطانوی سامراج کو وطن کے گلی کوچوں سے نکال باہر کیا جائے۔ اس سلسلے میں تحریکِ خلافت، کانگریس اور مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ خاکسار تحریک کی جد و جہد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں برصغیر کی صورت حال کے انقلابی رویے سے زندگی کے دوسرے شعبے متاثر ہوئے وہاں ادب و فن پر بھی ان کے اثرات مرتسم ہوئے۔ خصوصاً اردو ادب میں زبردست انقلاب آیا جس کے نتیجے میں سجاد ظہیر اور ان کے ہم خیال ادیبوں نے ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی داغ بیل ڈالی۔ اس تحریک نے ان کو بھی اپنے اثر میں لے لیا جو نظریاتی طور پر ترقی پسند نہیں تھے۔ ادب میں سماجی تنقید اور اجتماعی معاشرتی شعور کو منظم اور مستحسن انداز میں پیش کرنے اور اس رجحان کو فروغ دینے کا سہرا اسی ملک گیر تحریک کے سر ہے۔ غلام عباس بے شک ترقی پسند نہیں تھے لیکن ان کی کہانیاں ترقی پسندی سے سماجی حقیقت نگاری کے اعتبار سے دور نہیں ہیں۔ البتہ ان کی کہانیوں میں ترقی پسندوں کی طرح سماجی خرابیوں کی بنیاد عام طور پر معاشی و اقتصادی نہیں ہوتی بلکہ وہ انفرادی کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاشرے کی ناہمواری، اس میں ہونے والے استحصال، ظلم، قتل، ناانصافی، عداوت، سازش اور غربت و افلاس کا سبب قرار دیتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ رویہ ایک اصول اور رجحان کی طرح پایا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں فرد اگر خرابیوں سے پاک ہو جائے تو معاشرہ از خود آلائشوں سے پاک ہو جائے گا۔ وہ اپنے اسی افسانوی رویے سے ترقی پسندوں سے ضرور مختلف نظر آتے ہیں۔ مگر ان کے یہاں جس انداز میں سماجی حقیقت نگاری اور خارجی عناصر اپنی تمام تر صداقتوں کے ساتھ فن کی رگوں میں دوڑتے ہوئے ملتے ہیں وہ بے شک ترقی پسندی سے قریب ہیں۔ اس کے باوجود غلام عباس کے یہاں سماجی حقیقت نگاری کا وہ انقلابی رویہ نہیں پایا جاتا جو کرشن چندر، بیدی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اس تناظر میں بھی غلام عباس اپنے قدرے جدید اسلوب اور حقیقت نگاری کے باوجود طالسطائی اور پریم چند سے قریب نظر آتے ہیں۔ طالسطائی کی کہانیاں جمہوری آدرش اور انسان دوستی کی بنیاد پر لکھی گئی ہیں۔ ان کی عوام دوستی کا اعتراف لینن نے بھی کیا ہے لیکن اس تنقید کے ساتھ کہ اس کے یہاں بھی انقلاب کی وہ روح نہیں جو ایک انقلابی ادیب کی تحریر میں موجود ہونی چاہیے۔ لینن کا کہنا ہے کہ "اس کی زبان سے کروڑوں روسی عوام بولتے ہیں جو آج کی زندگی کے آقاؤں سے نفرت کرتے ہیں لیکن اب تک اس شعوری اور مسلسل جد و جہد کی منزل پر نہیں پہنچے جو آخر تک چلا کر کامیاب بنائی جاتی ہے۔" چونکہ پریم چند کے یہاں بھی مسائل کا حل خیال آرائی میں بدل جاتا ہے اس لیے ان کے اس رویے پر رام بلاس شرما کی یہ رائے حقیقت پسندانہ ہے کہ "لینن نے طالسطائی کو جس نظر سے دیکھا تھا اس نظریے پریم چند کو دیکھنا اور پرکھنا چاہیے"۔ کیوں کہ بہ قول سردار جعفری "ان کے (پریم چند کے) ناولوں اور کہانیوں کا بنیادی نقطۂ نظر کوئی سماجی یا معاشی مسئلہ ہوتا ہے لیکن اس کا

حل سماجی اور معاشی نہیں ہوتا بلکہ انفرادی ہوتا ہے وہ انقلاب کے بجائے انفرادی اور روحانی سدھار کی طرف چلے جاتے ہیں اور ایک ایسا آورش وادی طریقہ پیش کرتے ہیں کہ جو ممکن العمل نہیں ہے۔" غلام عباس کے یہاں آورش وادی طریقہ تو نہیں ہے لیکن اس سے ملتا جلتا ایک رویہ ملتا ہے۔ ان کے یہاں جرأت کی کمی ہے اور مصلحت کا دبدبہ ہے۔ غلام عباس نے خود بھی اپنی اس کمزوری کا اعتراف کیا ہے کہ "میرے افسانوں میں عام طور پر زندگی سے سمجھوتا ملتا ہے جس کے لیے اکثر انسانوں کو ریاکاری کرنی پڑتی ہے"۔ غلام عباس کی عملی زندگی پر اگر غور کریں تو وہ وہاں بھی سمجھوتا کرتے نظر آتے ہیں چونکہ انھوں نے اس کا بھی دعویٰ کیا ہے کہ وہ اپنی اکثر کہانیوں کا مرکزی کردار خود ہیں اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگی اور فن میں تضاد نہیں ہے جس طرح طالسطائی اور پریم چند کی عظمت ان کی انسان دوستی اور حقیقت نگاری کے سبب تاریخ ادب میں ہمیشہ قایم رہے گی اسی طرح غلام عباس بھی "آنندی"۔ "اورکوٹ"۔ "حمام میں" "سمجھوتا"۔ "جاڑے کی چاندنی"۔ "کن رس"۔ "فینسی ہیر کٹنگ"۔ "جواری" اور "کتبہ" جیسی کہانیوں کی وجہ سے ایک بڑے فن کار اور ایک مشتاق ادیب کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

غلام عباس کے یہاں کہانی بننے کا انداز کلاسیکی ہے لیکن موضوع و مواد نیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں عصری تقاضے اپنے مخصوص انداز میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ زبان میں سادگی کے ساتھ ایسی پرکاری ہے کہ دامنِ دل میکشد والی بات صادق آتی ہے۔ ان کے قلم میں ایک ایسا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کہانی کے آغاز ہی سے وہ کچھ ایسا اندازِ بیان اور واقعاتی سلسلہ شروع کرتے ہوئے اختتام تک پہنچتے ہیں کہ قاری بندۂ بے دام کی طرح ان کی کہانیوں کے نشیب و فراز، پیچیدہ مسائل، مختلف موڑ اور مختلف احساسات سے گزرتا ہوا ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ان کا مشاہدہ بے حد پختہ اور تنوع کا حامل ہے۔ ان کی کہانی میں کشش کا ایک سبب ان کے مشاہدے کی کرشمہ سازی بھی ہے۔ اور جب مشاہدے کا اظہار جزئیات نگاری کی سحرکاری کے ساتھ کہانی کے آنگن میں بار پاتا ہے تو نہ صرف کردار کے خدوخال اجاگر ہو جاتے ہیں بلکہ ماحول، فضا اور مکالمے ایسی فطری صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ فن کا ایک اعلیٰ نمونہ بن جاتا ہے۔ ان کے فن کی بنیاد معروضیت پر ہے۔ وہ داخلی ردعمل کو معروضی عمل کا سبب تصور کرتے ہیں۔ ان کے یہاں خیال آرائی بھی معروضی حقائق کے بغیر تخلیق نہیں پاتی۔ وہ اس باب میں غالب کے اس خیال سے کہ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی اور حالی کی اس بات سے کہ خیال مادے سے پیدا ہوتا ہے متفق نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "مشاہدے ہی سے خیال سوجھتا ہے جب خیال سوجھے تبھی لکھا جانا چاہیے"۔ گویا ذات کی اندھیری گلیوں میں بھٹکنے کے بجائے وہ ماحول شناسی کے قایل ہیں۔ وہ انسانی فطرت اور اس کی جبلت کی پہچان کے بھی بڑے ماہر ہیں وہ چہرے دیکھ کر دل کی کیفیت بھانپ لینے میں مشاق ہیں۔ انسان کی فطرت میں موجود خیر و شر کے دونوں پہلو ان کی نظر میں رہتے ہیں اور انہی پہلوؤں کو اپنی کہانی کے مختلف کرداروں کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ وہ افلاس زدہ معاشرے کے قصے کے ساتھ فرد کی مفلسی کی بھی بڑی دردناک بپتا لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اورکوٹ بھی ایک ایسی ہی بپتا ہے جس کو غلام عباس کے قلم نے امر بنا دیا ہے۔ اورکوٹ شرافت و غیرت کا ایک استعارہ ہے جس کے دامن میں غربت اپنی ناکام تمناؤں اور ان گنت محرومیوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ امریکہ جیسے عوام دشمن ملک میں بھی اس کہانی کو بے حد پسند کیا گیا۔ اس کا ترجمہ پروفیسر ابوالخیر کشفی نے انگریزی میں کرکے امریکہ سے انعام حاصل کیا تھا۔ اس کا ترجمہ ترکی زبان میں بھی ہوا اور ترکی کے ایک

اخبار نے اس نوٹ کے ساتھ شایع کیا کہ "گوگول نے ایک عظیم افسانہ اوورکوٹ کے نام سے لکھا تھا جس کے موازنے میں غلام عباس صاحب کا افسانہ ہیٹا نہیں رہے گا۔" غلام عباس سماج سے ایسے کردار منتخب کرتے ہیں جو بہ ظاہر بہت معمولی لگتے ہیں مگر بڑے اہم ہوتے ہیں بلکہ غلام عباس انھیں اہم بنا دیتے ہیں۔ وہ کردار خود تخلیق بھی کرتے ہیں مگر ان کا تخلیق کردہ کردار سوپر مین قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتا بلکہ حقیقت و صداقت کی دھوپ میں جل کر کندن کی صورت جاذب نظر ہو جاتا ہے۔ ان کے بعض کردار اپنی انوکھی شخصیت کے سبب عجیب و غریب بھی ہوتے ہیں۔ "حمام میں" بھائی کا کردار کچھ اسی قسم کا ہے۔ اس کہانی میں غلام عباس نے انسانی رشتے اور سماجی رابطے کی ان قدروں اور جذبوں کو لطیف طنز کے ساتھ پیش کیا ہے جو وفاداری بہ شرط استواری کی نظیر پیش کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے بعض ایسے گوشوں کو بھی سامنے لاتے ہیں جن کی اہمیت کا گمان ہمیں عام طور سے نہیں ہوتا لیکن جب ان گوشوں کو ان کی کہانیوں میں دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اتنے سامنے کی چیز پر اس سے پہلے نظر کیوں نہیں گئی۔ تحیر کا یہ احساس قاری کے اندر پیدا کرنا غلام عباس کی عظمت کا ثبوت ہے۔

فکشن میں طوائف ایک موضوع کی حیثیت سے ادیبوں کے لیے ہمیشہ دل چسپی کا سبب رہی ہے۔ بعض ادیبوں نے محض ذہنی تلذذ کے لیے انھیں اپنی کہانی کا موضوع بنایا اور بعض لکھنے والوں نے اس وسیلے سے دوسروں کے سفلی جذبات کو برانگیختہ کرکے اپنی شہرت و مقبولیت کا جواز پیدا کرنا چاہا۔ لیکن ہمارے یہاں ان ادیبوں کی بھی کمی نہیں جنھوں نے طوائفوں پر کہانی لکھ کر نہ صرف اپنے کردار کو امر بنایا بلکہ خود بھی امر ہو گئے۔ غلام عباس نے بھی اس موضوع پر کہانی لکھی اور اس طرح لکھی کہ ادب میں اس کی حیثیت شاہکار ہو گئی ہے۔ آنندی کئی لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے۔ انھوں نے عام روش سے ہٹ کر طوائف کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ لوگ گندگی سے بھرے ہوئے گٹر کو تو دیکھتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ گندگی کا سرچشمہ کہاں ہے؟ گندگی جنم کہاں لیتی ہے اور یہ بہہ کر کن صاف ستھرے علاقوں سے آتی ہے۔ کیا طوائفوں کو نکال کر شرفا کا محلہ برائیوں سے محفوظ رہا۔ غلام عباس نے بڑے لطیف طنز اور دل کش پیرائے میں معاشرے کے اس طبقے کے ذہنی افلاس اور بے شعوری کو پیش کیا ہے جو خود کو تمام برائیوں سے پاک سمجھتے ہیں اور علم و فضل اور ذہانت میں یکتا جانتے ہیں۔ مگر حقیقتاً ان کا کردار اور رویہ ان کی سطحیت اور کھوکھلے پن کا منظر نامہ ہیں۔ یہ کہانی اپنی نوعیت کے اعتبار سے واقعی منفرد اور تاریخ ساز ہے۔ اس کہانی میں غلام عباس کی جزئیات نگاری بڑی آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے۔ فن اور تکنیک کی بھی خوبیاں موجود ہیں۔ فیض کی شاعری کی طرح غلام عباس کے یہاں بھی دھیما پن ہے۔ جس طرح فیض نرم لہجے میں اپنے پڑھنے والوں کو گرفت میں لے لیتے ہیں اسی طرح غلام عباس بھی اپنے لہجے کی نرمی اور گھلاوٹ سے دلوں کو مسخر کر لینے کا فن جانتے ہیں۔

ان کی کہانیوں میں دل کشی، روانی اور ریڈابیلیٹی اس لیے زیادہ ہے کہ وہ لفظوں کے استعمال میں بخالت کی حد تک محتاط ہیں۔ وہ بے ضرورت تشبیہ و استعارہ کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ وہ ہر کہانی میں جزئیات نگاری کو بھی لازمی تصور نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں کہانیاں بغیر جزئیات نگاری کے بھی ملتی ہیں لیکن طنز کے نشتر تو وہ ہر کہانی میں چلاتے ہیں مگر ان کے طنز میں ایک خاص قسم کی حلاوت بھی ہے جس کی وجہ سے پڑھنے والے کا چہرہ بگڑتا نہیں بلکہ زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ ایک خاص قسم کی شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ طنز کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں موضوع کی رنگا رنگی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دوسرے

افسانہ نگاروں کی طرح انھوں نے اپنے آپ کو دھرایا نہیں ان کے ہر افسانے میں فضا اور ماحول کے ساتھ ساتھ کرداروں کے خصائص اور جبلتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ وہ اس کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ انداز پیش کش میں تازگی قایم رہے۔ فرد کی حسیت اور داخلی جذبوں کو اپنے مخصوص معروضیت کے ساتھ اس طرح افسانوں میں اجاگر کرتے ہیں کہ وہ ذات کا پرچار نہیں بننے پاتے بلکہ کردار نگاری کی ایک لازمی ضرورت بن کر تخلیقی سطح پر ابھرتے رہیں۔

فکشن کے تخلیقی سفر پر جن ادیبوں کا قافلہ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں روانہ ہوا تھا اس میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی اور خواجہ احمد عباس جیسے لوگوں کے ساتھ غلام عباس بھی تھے جنھوں نے اپنے ہم سفر ادیبوں کی طرح بے پناہ تخلیقی استعداد کا مظاہرہ کیا اور اعلیٰ پائے کے افسانے لکھے۔ لہٰذا آخر میں یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ وہ صف اول کے تاریخ ساز کہانی نویس تھے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کی ایک نادر پیش کش

اردو۔ انگریزی لغت

مرتبہ

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

اس لغت کی ضرورت ایک مدت سے محسوس کی جارہی تھی اور ایک خاص طبقے کی طرف سے بار بار اس کی اشاعت کا مطالبہ کیا جارہا تھا۔ جس میں اساتذہ اور طلبہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۰۸۰ صفحات کی ضخیم لغت نے اس ضرورت کو بھی پورا کر دیا جو اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں کو پیش آتی ہے۔ لغت میں اردو الفاظ ماخذ اور صحیح تلفظ رومن رسم الخط میں درج ہیں

انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ کراچی

غزل نما

تعارف و انتخابِ کلام

حسرت عظیم آبادی

ادا جعفری

میر محمد حیات نام۔ ہیبت قلی خاں خطاب اور حسرت تخلص۔ عظیم آباد وطن تھا۔ تقریباً بائیس سال تک وہیں رہے۔ پیدائش سنہ ۱۱۴۰ھ مطابق سنہ ۲۸-۱۷۲۷ء۔ وفات سنہ ۱۲۱۰ھ مطابق سنہ ۹۶-۱۷۹۵ء۔ میر محمد باقر حزیں کا تلمذ اختیار کیا۔ نوجوانی میں کہیں ملازمت نہیں کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں فراغت اور خوش حالی کی زندگی ہوگی۔ سیاسی ابتری اور بدحالی کے اثرات جب حسرت کی ذاتی زندگی پر اثر انداز ہوئے تو انہیں فکر معاش لاحق ہوئی اور پورینہ میں نواب شوکت جنگ کے دربار سے منسلک ہوگئے۔ نواب شوکت جنگ کی شکست اور قتل کے بعد حسرت نواب سراج الدولہ سے منسلک ہوئے اور ان کے دربار میں ممتاز عہدہ اور خطاب پایا۔

بعد ازاں یہ عہدہ امرا کی سازشوں کی نذر ہوگیا اور حسرت نامساعد حالات اور تنگ دستی کا شکار ہوئے۔ کچھ عرصہ مبارک الدولہ سے وابستہ رہے۔ لیکن یہ زمانہ بھی ان کا پریشانیوں میں گزرا۔

ان کی عمر کا آخری حصہ مرشد آباد میں بسر ہوا۔ یادِ وطن اور غمِ دوریٔ وطن کا اظہار ان کے کئی اشعار میں ملتا ہے۔

حسرت کی شاعری میں سادگی ہے۔ طرزِ ادا میں بھی اور طرزِ فکر میں بھی۔ مشکل پسندی اور تصنع اور نمائش سے انہیں لگاؤ نہیں تھا۔ ان کے کلام کا غالب حصہ عشق و محبت کی واردات کے بیان پر مشتمل ہے۔ لیکن ان کی عشقیہ شاعری میں معاملہ بندی سے متعلق اشعار کم ہیں۔

حسرت عظیم آبادی کا شمار ہند کے بڑے شعرا میں نہیں کیا جاتا لیکن وہ اپنے عہد میں بہار کے ایک قابلِ ذکر خوش گو شاعر تھے۔

یہ انتخاب "دیوان حسرت عظیم آبادی"، مرتبہ ڈاکٹر اسما سعیدی مطبوعہ ۱۹۶۸ء (ترقی اردو بورڈ نئی دہلی) سے کیا گیا ہے۔

انتخابِ کلام

ابتدائے آشنائی سے رہا نا آشنا
وہ وفا بیگانہ تھا کس دن ہمارا آشنا

عشق پوشیدہ نمایاں نہ ہوا تھا سو ہوا
چاکِ دل چاکِ گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا

اک جرعہ دُردِ مے پہ ہو اتنا نہ تلخ و تند
ساقی میں ایسے مست سے ہشیار ہی بھلا

عالم کے محبت کی کری میں نے بہت سیر
پر دیکھا نہ آغاز نہ انجام کسو کا

اگرچہ دل مرا خوش کرنا کچھ ضرور نہ تھا
ولے یہ شیوہ مروّت سے تیری دُور نہ تھا

ہر اک بہ امتیاز میاں تیرے گھر رہا
واں ایک میں ہی حلقۂ بیرونِ در رہا

گم کردہ راہ دشت میں بھٹکوں ہوں میں پڑا
میرا جو خضرِ راہ تھا یارب کدھر رہا

جوں شمع صبح تک تھا میں سوز و گداز میں
اے خانماں خراب تو شب کس کے گھر رہا

کس سے امید اپنے خبر لینے کی رکھوں
تو ہی جو حال دل سے مرے بے خبر رہا

عہدِ سابق میں تو بے درد نہ تھی خلق اتنی
اے فلک کیسا بنایا تیسے زمانہ اپنا

متوجہ تو اسے پایا میں اکثر لیکن
حالِ دل قابلِ اظہار نہ جانا اپنا

اگر جی کی اماں پاؤں تو میں اک عرض رکھتا ہوں
عداوت ہے عوض کس دین و ملت میں محبت کا

تیرا نور و ظہور تھا سب میں
شمع و گل اور مہر و مہ دیکھا

دل نہ سمجھا یا سمجھا اپنا ہائے
ہم نہ کہہ دیکھا اور کہہ دیکھا

رحم سہوا اسے نہ تھا ہم پر
ہم نے کیا کیا ستم نہ سہہ دیکھا

باب میں ہم بلا نصیبوں کے
ناز بھی اس کا ہے تغافل سا

ناصح تو بات کرنے کا پیدا نو کر شعور
مذکور کیا ہے عشق میں صبر و قرار کا

ایک مدت سے خیالِ رخِ دلدار کے بیچ
خواب کو دخل نہیں دیدۂ بیدار کے بیچ

پیغام میں کیا بھیجوں کہ جاتا ہے جو اُس پاس   کہتا ہوں میں کچھ اور وہ کہہ آئے ہے کچھ اور

آئے ہیں ہم جہاں میں غم لے کر   دل پر خون و چشم نم لے کر
ساغرِ مئے کہاں ہے اے گردوں   کیا کریں تیرا جامِ جم لے کر

مر گیا میں اس نے جب مجھ سے اکیلے یہ کہا   آپ تو رسوا ہوا ہے تو مجھے رسوا نہ کر

سہے گا دیکھئے کیا کیا جفا دل   ہوا کس بے وفا سے آشنا دل
تعلق عشق سے کیا مجھ کو لیکن   برا ہوتا ہے یہ اٹکا ہوا دل

دیکھیں نہ تجھے نہ آوینگے ہم   کہنا نہیں کہ دکھاوینگے ہم

رکھیں آستاں پہ ہم اس کے سر، اسی خاکِ کوپہ پڑے رہیں   یہ نمازِ عشق ہے زاہدا، اسے شرطِ وقت و وضو نہیں
ترا حال تو ہے بھلا برا وہ لے کیا علاج کریں ترا   یہ سمجھ اے حسرتِ خستہ جاں کہیں چاک دل کا رفو نہیں

بھولے سے اِدھر کو وہ جب آن نکلتے ہیں   کیا نظریں چرا ہم کو پہچان نکلتے ہیں

مرا نام و نشاں کیا پوچھتا ہے اے شہِ خوباں   تمہارا کمتریں عاشق ہے حسرت اس کو کہتے ہیں

لی اٹھا چشمِ مروّت ہم سے   بے مروّت اسے کیا کہتے ہیں
اس کے دل میں کبھی تاثیر نہ کی   اے محبت اسے کیا کہتے ہیں

اے مشکبو غزال گرہ کھول زلف کی   تا زیرِ سایہ اس کے ذرا آرمیدہ ہوں
سیمیں بروں کے عشق سے حسرت نہیں گریز   اس قوم کا میں بندۂ زر ناخریدہ ہوں

میں جدائی میں بھی دلدار سے مہجور نہیں   دل میں بستا ہے وہ آنکھوں سے مری دور نہیں
عشق میں صبر ہے ہر چند مفید اے ناصح   ہو سکے جس سے وہ جانے ہمیں مقدور نہیں

ہم تنگ سایہ کہ ہیں برگ و نوا سے محروم
ایک شبنم کی طرح دیدۂ تر رکھتے ہیں

گرچہ ہیں غواص دریائے سخن حسرت سبھی
ہر قلم کو دست گاہِ گوہر افشانی نہیں

ناصحا جا کہ ذکر عشق سوا
خوش نہیں آتی گفتگو مجھ کو

مہر و دل گرمی کی توفیق اگر تم کو نہیں
اک ذرا ہنس کے تو تم اہلِ وفا سے بولو

اب عشق ہے بے قیاس مجھ کو
رسوائی کا کب ہے پاس مجھ کو
ہے فرصت وقت اس سے اے ناز
کرنے دے کچھ التماس مجھ کو

کم نگاہی سے کم اِدھر دیکھو
دیکھتے ہو تو بھر نظر دیکھو
چشمِ لطف اس ستی نہیں بارے
حال میرے سے کر خبر دیکھو

کبھی احوال دل پوچھے جو ہم سے یار کیا کہیئے
زباں کو جب نہ ہووے طاقتِ گفتار کیا کہیئے

طلوعِ مہر ہو جوں صبح دم خطِ شعاعی میں
نمایاں ہے رخ اس کا یوں زری آنچل دوپٹے میں

عشق میں یار اگر وفا نہ کرے
کیا کرے کوئی اور کیا نہ کرے

مری بات سنتا ہے اس طور سے
کہ کہتا ہوں گویا کسی اور سے

کیوں بھلا ہم سے خاکساروں سے
تیرے دل پر غبار آتا ہے

کبریائی کو نہیں بارگہہِ عشق میں دخل
شاہ اس کوچے میں آوے تو گدا ہوتا ہے

معذور ہوں عاشق ترا گر مجھکو کہے خلق
میں اپنی زباں سے یہ کہا ہو تو قسم لے

عزیزو تم کو مبارک وطن کہ گردوں نے
جدا کیا ہمیں یار و دیار سے اب کے

عشق میں خواب کا خیال کسے
نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی

نپٹ یہ حالِ دل کچھ رسمسا ہے
یہ کس کی زلف کے خم میں پھنسا ہے

دور اس مہرو سے ہم شام و سحر رویا کیے
وائے ایسی زندگی پر عمر بھر رویا کیے

فنِ شاعری

مصنفہ:- ارسطو

ترجمہ:- پروفیسر عزیز احمد

(اشاعتِ سوم)

قیمت:- پانچ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی نمبر۱

گوشۂ طلبہ

نفسیات

تخلیقی فکر

پروفیسر طہیر نفسی

فکر ایک مخصوص تصوری عمل ہے جس کے دوران ماحول میں واقعتاً تبدیلیاں لائے بغیر محض علاماتی تبدیلیوں کے ذریعے در پیش مسئلے کا موزوں ترین حل تلاش کیا جاتا ہے یا کوئی ایجاد یا دریافت کی جاتی ہے۔ ادنیٰ جانوروں میں یہ کم و بیش غیر ترقی یافتہ شکل میں موجود ہوتا ہے لیکن انسانوں میں یہ عام اور امتیازی خصوصیت ہے۔ فکر کی بہت سی اقسام ہیں جن میں تخلیقی فکر (CREATIVE THINKING) ایک ایسی خوبی ہے جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

تخلیقی فکر میں انسان نئے رشتے تلاش کرتا ہے۔ مسائل کے نئے حل ڈھونڈتا ہے۔ طریقے اور وسیلے ایجاد کرتا ہے یا نئی فن کارانہ چیزیں اور صورتیں وضع کرتا ہے۔ تخلیقی فکر استدلال (REASONING) سے مختلف عمل ہے۔ دونوں میں اگرچہ کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے مگر طریقۂ کار اور نتیجہ دونوں کا مختلف ہوتا ہے۔ استدلال ایک نسبتاً سیدھا سادہ اور لگا بندھا راستہ ہوتا ہے جس پر کم و بیش سب ذہین انسان چلتے ہیں اور حقائق، مواد اور معطیات کے لحاظ سے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ لیکن تخلیقی فکر نسبتاً پیچیدہ اور آزادانہ روش کا نام ہے۔ یہ کبھی سیدھی ہوتی ہے اور کبھی آڑی ترچھی۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر استدلال ریل گاڑی کا راستہ ہے تو تخلیقی فکر سڑک کا۔ تخلیقی فکر کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب اور کیا انداز اختیار کرے گی اور اس کے کیا نتائج ظہور پذیر ہوں گے۔ تخلیقی فکر کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) مائل کلی فکر یا جزرسی (CONVERGENT THINKING) یہ تخلیقی فکر منطقی انداز کی ہوتی ہے۔ بعض صورتوں میں کسی مسئلے کا صرف ایک ہی صحیح حل ہوتا ہے۔ ایسے مسائل عموماً حساب وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ جیسے سیب کے گرنے سے نیوٹن نے کشش ثقل (GRAVITY) کا اصول دریافت کیا۔

(۲) تجزیاتی فکر (DIVERGENT THINKING): فکر کا یہ انداز اس وقت ہوتا ہے جب کوئی صحیح یا غلط جواب سامنے نہیں ہوتا۔ جتنے ممکن جوابات ہوتے ہیں وہ ایک سے نظر آتے ہیں۔ تخلیقی ذہن زیادہ سے زیادہ ممکن حل تلاش کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی نہ کوئی صحیح حل ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ جس طرح مشہور یونانی سائنسداں ارشمیدس (ARCHMEDESE) نے پانی کے ٹب میں نہاتے ہوئے تیرنے والی چیزوں کے بارے میں یہ اصول دریافت کیا تھا کہ ہر

چیز اپنے وزن کے برابر پانی ہٹاتی ہے۔

(۳) ایجاد (INVENTION) تخلیقی فکر کی نمایاں ترین قسم ایجاد یعنی نئی نئی مصنوعات تیار کرنا ہے۔ ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، گراموفون، کیمرہ، بلب، تھرمامیٹر، غرض کہ اس قسم کی بے شمار چیزیں جنھوں نے انسانی زندگی اور زمین کے نقشے کو بدل دیا ہے اسی تخلیقی فکر (ایجاد) کا کرشمہ ہیں۔

(۴) اختراع (INNOVATION) تخلیقی فکر پہلے سے بنی ہوئی چیزوں میں ندرت، ترمیم اور اصلاح بھی پیدا کرتی ہے۔ تکنیکی علوم میں ترقی سے تکنیکی آلات میں نت نئی تبدیلیاں اس کی بہترین مثال ہیں۔ ہر سال گاڑیوں کا نیا ماڈل، رنگین ٹیلی ویژن، نئی نئی قسم کی الیکٹرانک گھڑیاں، بہتر سے بہتر کیمرے، چھپائی کے بہتر سے بہتر طریقے وغیرہ تخلیقی فکر کی اسی قسم یعنی اختراع کے نتائج ہیں۔

وُڈورتھ کے مطابق تخلیقی فکر چار مراحل یا منازل سے گزرتی ہے۔ یہ منازل واضح بھی ہو سکتی ہیں اور غیر واضح بھی

(i) تیاری (PREPARATION) تخلیقی فکر کی پہلی منزل میں مسئلے کی تحلیل کی جاتی ہے۔ تمام معلومات جو مسئلے سے متعلق دستیاب ہوتی ہیں وہ اکٹھی کر لی جاتی ہیں۔ ذہن برابر جائزہ لیتا رہتا ہے کہ وہ مسئلے کے سلسلے میں نتیجہ خیز ہیں یا نہیں اگر کوئی نتیجہ نکلتا نظر نہیں آتا تو ذہن مزید چیزوں کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔

(ii) تعطل (INCUBATION) کسی نتیجے پر نہ پہنچنے کی صورت میں مسئلے کو عارضی طور پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگرچہ ذہن کبھی کبھی مسئلے پر سوچتا ہے مگر دوسرے مسائل اور حقائق پر بھی توجہ دیتا ہے۔ اس کی مثال پرندوں کے انڈے سینے کی ہے۔ حقائق کی تلاش جاری رہتی ہے۔ مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مسئلے کا حل خود بخود اچانک ابھر آتا ہے جیسے انڈے میں سے بچہ خود خول توڑ کر ظاہر ہو جاتا ہے۔

(iii) تنویر یا چمک یا آمد (ILLUMINATION) تعطل کے دوران ذہن چھوڑے ہوئے مسئلے سے غافل نہیں ہوتا بلکہ تحت الشعوری طور پر (SUBCONSCIOUSLY) ــــ اس کا حل تلاش کرتا رہتا ہے۔ جب تحت الشعور سے کوئی نسبتاً معقول حل اچانک ابھر آتا ہے تو ذہن شعوری طور پر اس کا جائزہ لینا شروع کر دیتا ہے۔ یہ حل ایک مفروضے (HYPOTHESIS) کی شکل میں ہوتا ہے اور عموماً اچانک اور بے ساختہ انداز میں ابھرتا ہے جیسے بادلوں میں بجلی چمک جائے۔

(۴) تصدیق و تشریح (VERIFICATION AND ELABORATION) جب چھوڑے ہوئے مسئلے کا کوئی ممکن حل ذہن میں ابھرتا ہے تو اس حل یا مفروضے کو پرکھا جاتا ہے۔ اس کی مکمل تفصیلات تیار کی جاتی ہیں۔ فنی اور سائنسی اصولوں کے مطابق اس کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنایا جاتا ہے۔ یہ مرحلہ خاصا طویل ہو سکتا ہے اور بار بار ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ یعنی فنی اور سائنسی اصولوں پر پورا نہ اترنے یا مسئلے کا صحیح حل ثابت نہ ہونے کی صورت میں دوبارہ تعطل کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کوشش شعوری سطح کی بجائے تحت الشعوری طور پر جاری رہتی ہے۔ حتیٰ کہ پھر کوئی نیا خیال کوندتا ہے۔ ذہن پھر شعوری طور پر اس کا تجزیہ اور اس کی ترمیم و اصلاح کرتا ہے۔ اگر حل ٹھیک نکلے

تو بہتر ورنہ پھر وہی تعطل کا عمل دہرایا جاتا ہے۔

تخلیقِ فکر کے ان تمام منازل و مراحل کی بہترین مثال ڈارون کی مشہور دھماکہ خیز کتاب اصل الانواع (ORIGIN OF SPECIES) تھی (۱) ڈارون (DARWIN) پندرہ سال تک ایک بحری جہاز میں مختلف ملکوں اور جزیروں کا سفر کرتا اور زندہ اور مردہ حیاتیاتی نمونوں کا جائزہ لیتا رہا۔ بھانت بھانت کے جانور، اور ان کے جسم اور اعضا کی نت نئی شکلیں دیکھتے دیکھتے اچانک اس کے دل میں خیال گزرا کہ زندگی ادنیٰ سے اعلیٰ اور سادہ سے پیچیدہ نمونوں کی صورت میں ایک طویل ارتقائی سفر سے گزری ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کیڑوں سے ترقی کرتے کرتے بندر بنا اور آخر کار انسان۔ (۲) چنانچہ ڈارون نے چند سو الفاظ پر مشتمل ایک مضمون لکھ کر ایک علمی مجلس میں پڑھا اور پھر پندرہ سال تک مزید تحقیق اور غور و خوض کرتا رہا۔ (۳) پھر ڈارون نے ۳۵ صفحات پر مشتمل مقالہ لکھا اور کچھ سائنس دانوں کو سنایا۔ مگر چونکہ اس کا نظریۂ ارتقاء اتنا چونکانے والا اور اختلافی تھا کہ اسے اشاعت کی ہمت نہ ہوئی اور اس نے پھر اس پر تحقیق کا فیصلہ کر لیا۔ (۴) مگر اسی زمانے میں ایک اور حیاتیات داں الفریڈ ویلیس (WALACE) نے تقریباً ایسا ہی نظریہ ایک مضمون کی صورت میں سائنسدانوں کے سامنے پیش کیا۔ اتفاق سے دونوں سائنسداں ایک دوسرے سے بے خبر ایک ہی نتیجے پر پہنچے تھے۔ ڈارون نے جو ویلیس اور اس کے نظریے کے بارے میں سنا تو اپنی کتاب جلد از جلد مکمل کر کے شائع کر دی اور اس طرح نظریۂ ارتقا کا دھماکہ کر ہی ڈالا اور دنیا بھر کی ساری لعنت اور تعریف اپنی جھولی میں ڈال لی۔

پریم چند کے مضامین کا مجموعہ

مضامین پریم چند

مرتبہ

عتیق احمد

قیمت:۔ چالیس روپے

انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ کراچی

نوشۂ طلبہ

سیاسیات

میگنا کارٹا

عبدالنعیم قریشی

جس طرح مہذب اور متمدن انسان نے نقاشی اور فنون لطیفہ یونان سے سیکھے، روحانیت کا درس مشرق سے لیا، الجبرا مسلمانوں سے سیکھا اسی طرح پارلیمانی جمہوری حکومت کے اصول اور ضابطے برطانیہ سے سیکھے۔ اس اعتبار سے برطانیہ وہ پہلا ملک ہے جس نے دنیا کو پارلیمانی زندگی سے روشناس کرایا۔ اور باقاعدہ پہلی پارلیمنٹ کا تجربہ بھی برطانیہ ہی میں کیا گیا ہے۔ اسی لیے برطانوی پارلیمنٹ کو (MOTHER PARLIAMENT) یعنی پارلیمنٹ کی ماں کہا جاتا ہے۔

برطانوی قوم اپنی تاریخ اور مزاج کے اعتبار سے بالکل منفرد قوم کہلائی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انگریز قوم میں دو متضاد کیفیات کا امتزاج دیکھتے ہیں۔ یعنی وہ جدید رجحانات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ قدامت پرست بھی ہیں۔ قدامت پرستی کی یہ علامت ان کے ہاں بادشاہت کے ادارے کے وجود اور اس کے ساتھ ان کے جذباتی لگاؤ سے ظاہر ہوتی ہے۔

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ انقلاب عام طور پر تبدیلی، تراش خراش اور کشت وخون سے عبارت ہوا کرتا ہے اور حکومتی سطح پر انقلاب پُرامن نہیں ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً ۱۷۸۹ء میں فرانس میں زبردست خونی انقلاب آیا۔ اس کے نتیجے میں مطلق العنانیت کا دور ختم ہوا۔ جمہوری حکومت کی بنیاد پڑی۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ ردِعمل کے طور پر زار شاہی کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ اشتراکی اصولوں کے ماننے والوں نے حاکمیت کی بنیاد رکھی۔ لیکن برطانیہ میں اس قسم کا کوئی سنگین انقلاب نہیں آیا۔ سترہویں صدی عیسوی میں چارلس اوّل کو خانہ جنگی کے باعث اپنی جان سے ضرور ہاتھ دھونا پڑا اور چند برسوں تک کرامویل (CRAMWELL) کی سربراہی میں ایک نئی قسم کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ تبدیلی دیرپا نہ تھی۔ کرامویل کی موت کے بعد برطانیہ میں وہی پرانا طرزِ حکومت رائج ہوگیا۔

انگریزی دستور اپنی فطرت اور ساخت کے اعتبار سے دنیا کا منفرد دستور ہے جس نے مسلسل ارتقائی شکل اختیار کی ہے۔ یہ ایک وقت میں کوئی مکمل شے کی شکل میں نظر نہیں آتا ہے۔ بقول منرو (MUNRO) ''انگریزی دستور کوئی مکمل چیز نہیں بلکہ مسلسل نشوونما کا نتیجہ ہے۔ یہ عقل اور اتفاقات کی پیداوار ہے جس کی راہنمائی کبھی تو حادثات نے خوب خوب کی ہے اور بھی اعلیٰ

منصوبہ بندی نے"۔ اور منرو کے اس مقولے کی روشنی میں یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ برطانوی آئین اپنی جمہوری قدروں کو اپنے مزاج اور روایات سے ہم آہنگ کرتا گیا ہے۔

برطانوی آئین اس کی ساخت اور مزاج کے متعلق مختلف لوگوں نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے کچھ مفکرین کے خیالات پیش کرتے ہیں۔

ولیم پٹ نے کہا ـــــــ: "اس ملک کا آئین اس کی عظمت کا آئینہ دار ہے۔ یہ آئین جمہوریت کی تباہیوں اور شہنشاہیت کے مظالم سے مبرّا ہے اور اس کی خوبی کا راز مختلف حصوں کے حسین امتزاج میں مضمر ہے"۔

جے۔ جی لیتھم ـــــــ: (J. G. LETHEM) "آئین برطانیہ کی کامیابی کی بڑی وجہ اس کی لچک ہے۔ اس میں معاملات کے فیصلے سیاست دانوں کی عقل و فہم پر چھوڑ دیئے گئے ہیں تاکہ ضرورت کے مطابق فیصلے کر سکیں۔ اس آئین میں قانونی موشگافیوں اور قانون کی تشریح کے لیے نہ تو وکلا کی ضرورت ہے اور نہ ہی تحریری دستاویزات کی"۔

میکنزی کنگ ـــــــ: (MACKENZIE KING) "آئین برطانیہ جس کو ہم پسند کرتے ہیں کچھ تحریر شدہ ہے کچھ غیر تحریری۔ اس کی ابتداء ماضی میں ہوئی۔ یہ رسومات اور رواجوں کی صورت میں معرض وجود میں آیا۔ اس کی بنیاد عام قانون پر رکھی گئی۔ یہ نظائر میگنا کارٹا، درخواست حقوق اور حقوق بل سے مل کر بنا ہے۔ اس کی اساس کچھ تو قانون پر اور کچھ پارلیمنٹ کے طریق کار پر رکھی گئی ہے۔ یہ برطانوی فطانت کے اعلیٰ ترین کارناموں کی نمائندگی کرتا ہے"۔ آج تک نہ کسی نے اس کو دیکھا ہے اور نہ ہی کسی نے تسلی بخش طریقے سے اسے بیان کیا ہے۔ تاہم جب کبھی آزادی اور حقوق کو خطرہ لاحق ہوتا ہے اس کی موجودگی کا احساس ہو جاتا ہے کیونکہ یہ ظلم و ناانصافی کے خلاف صدیوں کی جدوجہد کی تخلیق ہے اور آزادی کی روح اس میں سموئی ہوئی ہے۔

انگریزی دستور کو تاریخ وار چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نارمن دور کے آغاز سے ۱۴۸۵ء تک

(۲) ۱۴۸۵ء سے ۱۶۸۸ء تک

(۳) ۱۶۸۸ء سے ۱۹۰۹ء تک

(۴) ۱۹۰۹ء سے موجودہ عہد تک

ان ادوار میں ہونے والی اصلاحات اور تبدیلیوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ تاہم ہم ذیل میں دستوریت کی مختصر تاریخ بیان کریں گے اور میگنا کارٹا کے اہم واقعہ کے ساتھ اس مضمون کو ختم کر دیں گے۔

برطانوی دستور میں سب سے دلچسپ اور نمایاں چیز اس کی ترقی اور مسلسل ارتقاء ہے۔ یہاں پارلیمانی سسٹم کی ابتدا اینگلو سیکسن (ANGLO SAXSON) عہد حکومت سے ہوتی ہے۔ برطانوی تاریخ کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب مسیحیت کی ابتدا سے پہلے کلٹ قوم رودبار انگلستان کو عبور کر کے برطانوی جزیروں میں آباد ہوئی۔

رومن عہد میں یہ جزیرے مختلف حملہ آوروں کے شکار رہے۔ اس سلسلے کا پہلا حملہ جولیس سیزر نے ۵۴ قبل مسیح

میں کیا لیکن اس نے ملک پر مستقل قبضہ نہیں کیا۔ اس حملے کے تقریباً سو سال بعد شہنشاہ کلاڈلیس نے فوج کشی کر کے اس ملک کو فتح کر لیا اور اس کے بعد تقریباً چار سو سال تک انگلستان رومن شہنشاہیت کا ایک صوبہ ہو گیا۔ رومی فاتحین نے بڑی بڑی سڑکیں بنوائیں شہر آباد کئے اور تجارت کو بڑی ترقی دی۔ لیکن پھر بھی انگلستان رومن آبادی نہ بن سکا۔ اس لیے جب پانچویں صدی کے اوائل میں رومی انگلستان چھوڑ کر چلے گئے تو ان کے قائم کئے ہوئے سیاسی ادارے بھی ختم ہو گئے۔

رومی حکومت کے خاتمے کے بعد جو قومیں انگلستان میں آکر آباد ہوئیں ان میں (DANES ANGLES) اور (SEX SON) سیکسن قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں قوموں کی یہ خصوصیت بھی بیان کی جاتی ہے کہ انھوں نے یہاں سے دوسری قوموں کو بھگا دیا۔ ان دونوں قوموں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سات بادشاہتیں قائم کیں۔ ہر بادشاہت بالکل آزاد تھی۔ اس کے بعد ان میں آپس میں جھگڑے اور فساد شروع ہوئے اور بالآخر زیادہ مضبوط بادشاہت نے کمزور ترین بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ اور ان پر قابض ہو گئے۔ آخر میں صرف دو بادشاہتیں رہ گئیں۔ نویں صدی عیسوی میں WESSEX کی بادشاہت دوسری بادشاہت پر غالب آگئی۔ اور جب سارا ملک ہی ایک بادشاہت کے زیر نگیں آیا تو سارے ملک میں قومیت کا جذبہ بھی پیدا ہونے لگا اور قومِ برطانیہ کی ابتدا ہوئی۔ لیکن ایک بادشاہت قائم ہونے کے باوجود پورے ملک میں مضبوط مرکزی حکومت قائم نہ ہوئی۔ سابقہ بادشاہتیں اب صوبوں یا SHIRES کی شکل میں تھیں اور بڑے بڑے نوابوں کی ماتحتی میں کام کر رہی تھیں۔ یہ نواب اپنے دور کے کافی با اثر لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔

برطانیہ میں بادشاہت اس اعتبار سے موروثی تھی کہ وہ ایک خاندان میں محدود تھی۔ جانشینی کے مسئلے کو ایک کونسل طے کرتی تھی جو WITAN کہلاتی تھی۔ WITAN کے اراکین میں بڑے بڑے نواب، فوجی افسران، پادری اور بادشاہ کے دوسرے عزیز واقارب شامل تھے۔ بادشاہ دراصل لڑائیوں میں اپنی قوم کا سردار ہوتا تھا۔ WITAN کی منظوری سے وہ قانون بناتا تھا۔ اور اس کے نافذ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کونسل کے ممبران کی تعداد مقرر نہ تھی بلکہ یہ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ یہ کونسل ملک کے لیے قانون بنانے کے ساتھ ساتھ ٹیکس لگاتی تھی۔ دوسرے ملکوں کے ساتھ صلح اور جنگ کے اختیارات بھی اس کونسل کے پاس تھے۔ یہ اپیل کی بھی سب سے بڑی عدالت تھی۔ اس اعتبار سے یہ وسیع اختیارات کی مالک تھی۔

جب نارمنڈی کے ڈیوک ولیم نے ۱۰۶۶ء میں برطانیہ کو فتح کر لیا تو یہاں سے نارمن عہد حکومت کا آغاز ہوا۔ اس عہد میں پہلی دفعہ برطانیہ میں مضبوط مرکزی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ بادشاہ کے اختیارات پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئے۔ ولیم نے ملکی نظم ونسق اور انتظامیہ کو چلانے کے لیے ایک بڑی کونسل قائم کی۔ اس کونسل میں بڑے بڑے جاگیردار، پادری اور سرکاری افسر شامل تھے۔ اس کے اجلاس سال میں تین بار بلائے جاتے تھے۔ اس عہد میں کیونکہ بادشاہ اینگلو سیکسن دور کے بادشاہوں سے زیادہ با اختیار تھے اس لئے یہ کونسل WITAN کے مقابلے میں زیادہ کمزور نظر آتی ہے۔ نارمن عہد کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بادشاہ مطلق العنان تھے۔ فوجوں کے سپہ سالار کی حیثیت اسے حاصل تھی ان تمام باتوں کے باوجود اس عہد میں سیاسی اداروں کا آغاز ہوا۔ مثلاً بڑی کونسل نے آگے چل کر پارلیمنٹ کی شکل اختیار کی۔ خزانے اور عدالتوں کا آغاز بھی اسی زمانے سے ہوا۔

برطانوی دستوریت کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ منشور اعظم یا "میگنا کارٹا" (MAGNA CARTA) کا وجود میں آنا ہے۔

یہ منشورِ اعظم یا میگنا کارٹا برطانوی دستوریت کے محل کی خشتِ اوّل قرار پاتا ہے۔ ذیل میں ہم ان واقعات کا ذکر کر رہے ہیں جو اس عظیم منشور کے وجود میں آنے کا سبب بنا۔

منشورِ اعظم (MAGNA CARTA OF THE GREAT CHARTER) پہلے دور کا سب سے اہم واقعہ منشورِ اعظم یا میگنا کارٹا کا وجود میں آنا ہے۔ ولیم نارمنڈی کا پڑپوتا ہنری دوم خاصا طاقتور اور مضبوط حکمراں ثابت ہوا مگر اس کا بیٹا "جان" دبے ہوئے جاگیرداروں کو مزید دبانے میں ناکام رہا۔ اور اسے ۱۵ جون ۱۲۱۵ء کو منشورِ اعظم کی دستاویز کی منظوری شاہی مہر ثبت کر کے دی۔ جان کی کمزوری کا حال یہ تھا کہ جب اس نے میگنا کارٹا کے سلسلے میں جاگیرداروں کو محل میں طلب کیا تو انھوں نے وہاں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ ناچار شاہ کو خود "رنے میڈ" (RUNNY MEDE) کے مقام پر پہنچنا پڑا اور وہاں منشورِ اعظم کی تکمیل ہوئی۔

منشورِ اعظم یا میگنا کارٹا کی رو سے شاہ نے اپنے اختیارات پر مندرجہ ذیل پابندیاں عائد کر لیں۔

(۱) ورثہ کو جائیداد حاصل کرنے کا قانونی اختیار حاصل ہو گیا۔ اب ان کی جائیداد ضبط نہیں کی جا سکتی تھی۔

(۲) قرضہ جات کی ادائیگی کے لیے غیر منقولہ جائیداد ضبط نہیں کی جا سکتی تھی بشرطیکہ منقولہ جائیداد کافی ہو۔

(۳) آئندہ شاہ کو اخراجات کے لیے رقم حاصل کرنے کے لیے آرک بشپ، بشپ اور ارل بیرن اور اسی قسم کے دوسرے قائدین سے مشورہ کرنا ہوگا۔

(۴) عام مقدمات کی سماعت بادشاہ کی عدالت کی بجائے موقع پر ہونا قرار پائی۔

(۵) جرمانے جرم کے مطابق ہونے چاہییں۔ نیز ارل اور بیرن قسم کے لوگوں کو بڑے نوابوں (PEERS) کی اجازت کے بغیر جرمانے نہیں کیے جا سکتے۔

(۶) مملکت کے افسران اپنے کسی فعل کے لیے بادشاہ کی پناہ نہیں لے سکتے۔

(۷) کسی بھی آزاد آدمی کو باقاعدہ مقدمہ چلائے بغیر گرفتار، قید اور ملک بدر نہیں کیا جا سکتا۔

(۸) اعلیٰ افسران اور ججوں کا تقرر قابل لوگوں میں سے ہونا چاہیے۔

(۹) مذہب کی آزادی کی ضمانت دی گئی۔

(۱۰) تاجروں پر ناروا ٹیکس عائد نہیں کیے جا سکتے۔

(۱۱) دستاویز پر عمل درآمد کی نگرانی کے لیے ۲۵ جاگیرداروں (BARON) پر مشتمل ایک کونسل قائم کرنا منظور کیا گیا۔

بعد میں منشورِ اعظم کے سبب سیاسی تنظیم میں کیا مدد حاصل کی گئی اس بارے میں پروفیسر "ایڈمز" نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے ——

"منشورِ اعظم نے سیاسی تنظیم کے بارے میں دو ضروری نکات کی بنیاد رکھی ہے جو آج تک قائم ہے۔ نکات حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) مملکت میں چند ایسے بنیادی اصول موجود ہیں جن کی پابندی کرنا بادشاہ پر فرض ہے۔

(۲) اگر حکومت ان اصولوں کی پابندی نہ کرے تو عوام کا حق ہے کہ انھیں تسلیم کرنے پر مجبور کر دیں۔"

گلہائے رنگ رنگ

بنگالی

ناگن کا انتقام

تاراشنکر بندوپدھیائے، ترجمہ: نجم الحق

بھٹے سے اینٹیں نکال نکال کر وہ باہر پھینکتا جا رہا تھا۔

اس کا نام شیخ لنگڑو تھا۔ یہ نام شاید اس لیے تھا کہ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کا کوئی اور نام تھا تو اس سے نہ وہ خود واقف تھا اور نہ کسی اور کو یہ پتہ تھا۔ وہ لنگڑا ہونے کے ساتھ ساتھ کافی بدصورت بھی تھا۔ اس کی ناک کی جگہ بڑا سا غار تھا اور چہرہ چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ غرض کہ انسان کی بجائے وہ حیوان لگتا تھا۔

ادائی اپنی بیل گاڑی ہانکتا ہوا شیخ لنگڑو کی طرف آ رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار سست ہوتے دیکھ کر اس نے بیلوں کے دم کھینچ کر رفتار تیز کرنے کی کوشش کی، مگر گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ادائی نے جھنجھلا کر بیلوں کو چابک لگائی پھر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور نتھنوں سے آوازیں نکال کر آگے بڑھنے سے انکار کرتے رہے۔

بیلوں کے سامنے ہی ایک زہریلا سانپ رینگ رہا تھا۔ ادائی نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی اور ہاتھ میں اینٹ کا ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا لیا۔

"نہیں ...... مت مارو اسے ...... مت مارو میں آ رہا ہوں ...... میں اسے پکڑوں گا۔"

شیخ لنگڑو نے مخالف سمت سے اپنی مخصوص بھدی چال میں دوڑتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"خدا کی قسم کتنا خوبصورت ہے یہ ...... منہ کتنا سرخ ہے، جیسے سیندور لگا دیا ہو کسی نے۔ اور سر پر بنا ہوا یہ سفید دائرہ بھی کتنا حسین لگ رہا ہے، جیسے چھوٹا سا تاج ہو ...... لیکن یہ تو بھاگ رہا ہے ......"

اور سانپ تیزی سے رینگتا ہوا اینٹوں کے بھٹے میں داخل ہو کر غائب ہو گیا۔

"انتہائی زہریلا گہمن تھا، بہت کم ہاتھ لگتا ہے۔ اگر پکڑ لیتا تو کچھ آمدنی کی صورت نکل آتی۔" شیخ لنگڑو نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

شیخ لنگڑو ایک پیشہ ور سپیرا تھا اور لوگوں کو سانپ کے تماشے دکھا کر اچھی آمدنی کر لیتا تھا۔ اس کی جھونپڑی کی موری میں متعدد چھوٹی چھوٹی پٹاریاں لٹک رہی تھیں جن میں وہ سانپوں کو بند رکھتا تھا۔ جب وہ کافی دبلے ہو جاتے تو انہیں کسی میدان میں چھوڑ آتا۔ کتنے تو پٹاری ہی میں دم توڑ دیتے۔

اس کے قبضے میں جب کوئی سانپ آ جاتا تو اس کے دل میں محنت مزدوری سے نفرت سی پیدا ہو جاتی اور وہ مہینہ

اکڑ لئے، کاندھے پر سانپ کی پٹاری رکھے اور ہاتھ میں بین لیے لوگوں کو تماشہ دکھلانے شہر کی جانب نکل جاتا۔ آمدنی اچھی خاصی ہو جاتی تھی۔ مگر آمدنی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ افیم اور گانجا کی مقدار بھی بڑھ جاتی اور اگر کسی روز آمدنی قیاس سے زیادہ ہو جاتی تو شراب کا دور بھی چل جاتا۔

لیکن جب اس کے سبھی سانپ ختم ہو جاتے تو وہ پھر سر پر ٹوکری اور ہاتھ میں پھاؤڑا لئے روزگار کی تلاش میں نکلے جاتا اور مارا مارا پھرتا۔ اگر کہیں کام مل جاتا تو وہ کام دینے والے کا شکریہ اس طرح مسکرا کر ادا کرتا کہ اس کا بدصورت چہرہ خوفناک لگنے لگتا۔

وہ کام چور نہیں تھا۔ جو بھی کام ملتا وہ اسے محنت اور لگن سے کرتا تھا اور اگر کبھی کام نہ ملتا تو بھیک بھی مانگ لیا کرتا تھا۔ لیکن اس کی ٹوکری اور پھاؤڑا ہمیشہ اس کے ساتھ ہی ہوتا اور دل میں کام مل جانے کی ہلکی سی امید بھی۔

شام کو جب افیم اور گانجا کے نشے میں چور خالی جیب گھر لوٹتا تو اپنی بیوی کے پاؤں پکڑ کر گلوگیر آواز میں کہتا "تو بھی کتنی بدقسمت ہے کہ ایک اپاہج سے بیاہ دی گئی، جو تجھے فاقہ کے سوا کچھ نہیں دے سکتا"۔

زبیدہ اس کی باتیں سن کر ہنس دیتی اور کہتی — "اچھا اب بس کرو........ میرے پاؤں چھوڑو تمہارے لیے میں کچھ کھانے کو لے آؤں"۔

یہ تھی ان کی روز کی زندگی۔

دوسرے روز پو پھٹتے ہی وہ ہاتھ میں چھڑی اور بغل میں پٹاری دبائے اینٹوں کے بھٹے پر پہنچ گیا۔

مشرق کی طرف آسمان گلابی نظر آ رہا تھا۔ درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور بستی کے مندر سے گھنٹے کی آواز آ رہی تھی شاید شیو بھگت پوجا میں مشغول تھے۔ شیخ لنگڑو ایک ٹیلے پر باز کی طرح بیٹھا چاروں طرف گھور رہا تھا، جیسے وہ اپنے شکار کو تلاش کر رہا ہو۔

سرخی آہستہ آہستہ مشرق میں پھیلنے لگی تھی جس کی روشنی میں بھٹے کی اینٹیں بھی سرخ نظر آنے لگی تھیں اور لنگڑو کے میلے کپڑے میں بھی ایک چمک سی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کا رنگ گیروا لگنے لگا تھا۔

لنگڑو ٹیلے پر بیٹھا ہوا یکبارگی چیخ اٹھا — "وہ رہا........ وہ رہا......"

نزدیک ہی کھلے میدان میں سانپ پھن کاڑھے اطمینان سے کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سورج کی کرنوں سے آنکھ ملانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس وقت وہ واقعی بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے لنگڑو بھی اس کے حسن میں کھو گیا۔

آہستہ آہستہ پھر وہ ٹیلے سے اترا اور دبے قدموں سے آگے بڑھتا گیا۔ سانپ میں ذرا بھی حرکت نہ ہوئی جیسے وہ بھی صبح کے حسین مناظر میں کھو گیا ہو۔ لیکن لنگڑو کے قریب پہنچتے ہی اس نے یکبارگی اپنا رخ بدلا اور سیٹی کی طرح آواز منہ سے نکالتا ہوا لنگڑو کو ڈسنے کے لیے بڑھا ہی تھا کہ لنگڑو نے جلدی سے اپنی چھڑی سے اس کا سر زمین میں دبا دیا اور اس کی دم کو اپنے بائیں ہاتھ میں لے کر تھوڑی دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد بڑبڑایا — "اوہ........ ناگن ہے....."

اس واقعہ کے چھ ماہ بعد ایک روز جب وہ کانجا کی دکان سے لوٹا تو اپنی بیوی کو آواز دی۔ "زبیدہ، دیکھو میں کیا لایا ہوں "

"کیا لائے ہو؟" زبیدہ نے پوچھا، جو ہاتھ میں جھاڑو لیے کوٹھری کی صفائی میں مشغول تھی۔

لنگڑو نے اپنے انگوچھے کے ایک کونے کی گرہ کھول کر زبیدہ کو ایک چھوٹا سا بلاق دکھایا۔" اتنا چھوٹا سا بلاق تم کس کے لیے لائے ہو؟"

"تمہاری سوتن کے لیے" لنگڑو نے ہنس کر کہا اور برابر والی کوٹھری میں چلا گیا۔

جب وہ کوٹھری سے نکلا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے ناگن کو اپنی گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ ناگن چھ ماہ میں کافی بڑھ چکی تھی۔ مگر اس میں پہلے کی طرح چستی نہیں تھی۔ ناگن اس کی گردن کے گرد کلبلا رہی تھی اور اس کا پھن اوپر کی جانب اٹھا ہوا تھا۔

"خدارا، ناگن سے اس طرح نہ کھیلو۔ جانے کب ڈس لے" زبیدہ نے سمجھایا۔

"ہاہا........ ہاہا....." لنگڑو نے قہقہہ لگایا۔

تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن تمہیں کیا معلوم کہ سانپ کے دل میں بھی محبت جنم لے سکتی ہے۔ اور پھر میں نے تو اس کے دو زہریلے دانت بھی نکال دیے ہیں۔ ویسے بھی اس نے کبھی مجھے ڈسنے کی کوشش نہیں کی" اور یہ کہہ کر اس نے ناگن کے منہ کو چوم لیا۔

زبیدہ سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ بول اٹھی ——— "کیا میرے لیے تمہارے دل میں ذرا بھی محبت نہیں ۔کیا تمہارے لیے یہی ناگن سب کچھ ہے؟"

لنگڑو نے اس کی باتوں پر دھیان تک نہ دیا اور اپنے جسم پر کلبلاتی ہوئی ناگن کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "دیکھو، دیکھو کس طرح یہ میری باہوں میں چلی آئی ہے۔ جیسے کوئی حسینہ اپنے محبوب کی باہوں میں آجائے"

"اچھا، اچھا بہت ہو چکا، اب اور نہیں دیکھا جائے گا مجھ سے یہ تماشہ" زبیدہ نے غصہ سے کہا۔

لنگڑو نے ناگن کو اپنے جسم سے اتار کر زمین پر رکھ دیا اور سوئی ہاتھ میں لے کر اس کی ناک چھیدنے کی کوشش کرنے لگا۔ تاکہ وہ چھوٹا سا بلاق اسے پہنا دے۔ اس نے ناگن کی دم کو اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے دبایا اور منہ کو بائیں ہاتھ میں لے کر دائیں ہاتھ سے ناک میں سوئی چبھو دی اور بلاق پہنا کر چھوڑ دیا۔ درد کی شدت سے ناگن نے زمین پر اچھلنا شروع کر دیا۔ لیکن لنگڑو ہاتھ میں پٹاری کا ڈھکن لیے خود کو بچا تا رہا۔ پھر اس نے اپنی بیوی کو پکارا۔

"زبیدہ ذرا آئینہ تو لیتی آنا، میں اپنی ناگن کو اس کا چہرہ دکھا دوں"

"نہیں، میں ہرگز اپنا آئینہ نہیں دوں گی۔" زبیدہ نے جل کر کہا۔

"میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں زبیدہ تھوڑی دیر کے لیے اپنا آئینہ دیدو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر کیا کرتی ہے"

آدھی رات کے قریب زبیدہ لنگڑو کی کوٹھری میں سونے کے لئے پہنچی مگر ابھی اس کی آنکھ بھی نہ لگ پائی تھی کہ وہ چیخ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور لنگڑو کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "جلدی اٹھو۔ کسی چیز نے مجھے ڈس لیا ہے"۔

لنگڑو نے اٹھ کر فوراً چراغ روشن کیا۔ زبیدہ کے بائیں پیر کے انگوٹھے سے خون کا ایک قطرہ نکل کر جم گیا تھا اور ناگن بھی قریب ہی کونے میں رینگ رہی تھی۔

زبیدہ نے چلا کر کہا۔

"وہ دیکھو، وہ بھاگ رہی ہے۔ ظالم نے آخر ڈس ہی لیا"۔

لنگڑو نے لپک کر ناگن کو پکڑ لیا اور اسے پٹاری میں بند کر کے ڈھکن لگا دیا اور منہ کو پٹاری کے قریب کر کے زور سے بولا۔

"سن۔۔۔ اگر میری زبیدہ کو کچھ ہو گیا تو میں تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا"۔

لیکن زبیدہ تو کب کی دم توڑ چکی تھی۔ کئی گاؤں سے سانپ کا زہر اتارنے والے اوجھا آئے مگر ناکام لوٹ گئے۔ ایک نے جاتے جاتے لنگڑو سے کہا۔ "خدا کا شکر ادا کر و لنگڑو کہ تم بچ گئے۔ ورنہ یہ ناگن ایسی ہے کہ اپنے دشمن سے بدلہ لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھتی۔ شاید وہ تمہیں ڈسنے آئی تھی"۔

"نہیں، ایسی بات نہیں تھی"، لنگڑو ڈبڈبائی آنکھوں سے اوجھا کی طرف دیکھ کر بولا۔ وہ زبیدہ کا سر اپنی گود میں رکھے افسردہ بیٹھا رہا۔

زبیدہ کی موت کے بعد لنگڑو نے گھر چھوڑ دیا اور فقیروں کی سی زندگی اختیار کر لی۔ اس کے گھر کی جگہ اب ایک کھنڈر ہے اور اس کے برابر سے ہو کر جانے والی پگ ڈنڈی کا اب نام و نشان مٹ چکا ہے۔ اب ادھر سے کوئی نہیں گزرتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب وہاں زہریلے سانپوں کا بسیرا ہے اور وہاں رہنے والے سب ہی سانپ اسی ناگن کی نسل کے ہیں۔

لنگڑو نے ناگن کو ختم نہیں کیا تھا۔ اس نے اسے چھوڑنے سے قبل صرف اتنا کہا تھا ـــــــ "میں اگر چاہوں تو تجھے مار سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں تجھے زبیدہ کی موت کا ذمہ دار نہیں سمجھتا۔ تجھے تو تیری فطرت نے مجبور کیا تھا۔ دنیا کی ہر عورت ذات کے دل میں سوکن کے لیے نفرت ہوتی ہے۔ اگر تیری جگہ زبیدہ ہوتی تو وہ بھی تجھے ہرگز نہ چھوڑتی"۔

اردو تھیٹر

چار جلدوں میں

مرتبہ : ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی

گل ہائے رنگ رنگ

سندھی

خوشبو

ڈاکٹر تنویر عباسی ۔ ترجمہ آفاق صدیقی

یہ رات کی رانی وہ سوسن
یہ گلُ ہے اور وہ سنبل ہے
یہ میرا چمن وہ تیرا چمن
یہ پھول مرے وہ پھول ترے
ترے باغ سے خوشبو آتی ہے
مرے باغ سے خوشبو جاتی ہے
خوشبو کے آنے جانے کو
تو کیوں روکے
میں کیوں ٹوکوں
یہ تیری بھی ہے میری بھی ۔
یہ سانسوں میں بس جاتی ہے
یہ روحوں کو مہکاتی ہے
خوشبو اک تحفۂ فطرت ہے
خوشبو تو پیار کی دولت ہے
وہ پھول ہوں غنچے یا کلیاں
برباد نہ ہوں ، پامال نہ ہوں
آباد رہے گلزار ترا
شاداب رہے یہ میرا چمن
خوشبو پہ کوئی پہرہ نہ لگے
اے خوشبو! تو آزاد رہے

گرد و پیش

اِسلام آباد ـــــــ "اقبال بچوں اور نوجوانوں کے لیے"

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے شیخ الجامعہ کی زیر ہدایت حال ہی میں خصوصی اشاعتی سلسلے کا اجراء کیا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب "اقبال بچوں اور نوجوانوں کے لیے" ہے جس میں نئی نسل کے لیے کلام اقبال کے انتخاب کے علاوہ اقبال کی اردو اور فارسی منظوم کہانیوں کو آسان اردو نثر میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کی قیمت ۱۵ روپے ہے۔ یہ کتاب علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سیکٹر، ایچ۔ ۸ اسلام آباد کے علاوہ اس کے علاقائی دفاتر سے بھی مل سکتی ہے۔ مختلف شہروں کے بک اسٹالوں پر اس کی فروخت کا اہتمام بھی کیا جا رہا ہے۔

جدہ ـــــــ پچھلے ہفتے الطاف حسن قریشی مدیر اعلیٰ ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ"، حکومت سوڈان کی دعوت پر پاکستان سے جانے والے دانشوروں، محققین، مصنفین اور مجلسِ شوریٰ کے اراکین کے ساتھ خرطوم گئے تھے۔ جہاں اسلامی شریعہ کے نفاذ کی پہلی سالگرہ کی تقریب بڑے احترام اور شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی۔ اس تقریب میں شرکت کے بعد بہ غرضِ عمرہ الطاف صاحب جب جدہ آنے لگے تو انھوں نے نوجوان شاعر تسلیم الہیٰ زلفی سے اپنے دیرینہ تعلق و محبت کا حق یوں نبھایا کہ پی آئی اے کا مہمان ہونے کے باوجود زلفی کو براہِ راست ٹیلی فون پر اپنی جدہ آمد کی اطلاع دی اور یہاں پہنچ کر سارا وقت زلفی ہی کے ساتھ گزارا۔ مکۃ المکرمہ گئے، عمرہ کیا، ساری رات طواف و سجود میں گزاری۔ دوسرے روز (یوم جمعہ) تسلیم الہیٰ زلفی نے اپنے گھر جدہ کے معروف شعراء و ادباء کو مدعو کیا۔ اخباری نمائندے بھی تشریف فرما تھے تاکہ الطاف حسن قریشی سے گفتگو ہو سکے۔ سوڈان میں ہونے والی تقریبات کی تفصیلات معلوم ہوں اور پاکستان کے موجودہ حالات کا ایک سینئر صحافی کی زبان .... سے اندازہ ہو سکے۔ ایک گھنٹے کی نشست میں گفتگو کے پہلے دور میں سجاد بابر، تسلیم زلفی، قیوم طاہر، شاہد نعیم، سعودی ایئر لائنز کے کپتان قیوم سعید اور مرزا اخلاق بیگ نے مختلف زاویوں پر سیر حاصل گفتگو کی جبکہ ظہرانے کے بعد مقامی انگریزی اخبار "عرب نیوز" کے سینئر نمائندے مسٹر رام کمار (مع فوٹو گرافر ایس۔ ایم نقی) نے ان کا انٹرویو لیا۔ وقت کی کمی کے باعث شعری نشست منعقد نہیں ہوئی۔ اس یادگار ملاقات میں زیر ترتیب مجموعۂ کلام "پھول کھلے یا نہ کھلے" کے شاعر شجاعت علی راہی کی کمی شدت سے محسوس کی گئی۔ دراصل ان دنوں وہ علیل ہیں۔ خدا سے ان کی شفایابی کے لیے احباب دعا گو ہیں۔

شاہد نعیم۔ جدہ

جدّہ

جدّہ میں جواں سال صحیفہ نگار مدیر روزنامہ ''منصف،، جناب محمود انصاری نے خلیج میں مقیم حیدر آباد کے لوگوں کے نمائندہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں میں اتحاد و تنظیم اور اصلاحِ معاشرہ کو وقت کا اہم ترین تقاضہ قرار دیا۔

بزم اردو جدّہ کے زیرِ اہتمام منعقدہ اس اجتماع کی صدارت صدر بزم جناب حسن چشتی نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں اعلان کیا کہ بزم نے ہر سال دو ادیبوں یا شاعروں کی تخلیقات اپنے مصارف سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

بزم کے نائب صدر علم دار حسین جدّی نے جدّہ میں مقیم ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی علمی و ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ ابتدا میں معتمد بزم جناب شریف اسلم نے مختصراً بتایا کہ بزم نے اپنے قیام کے بعد سے آج تک علمی، ادبی اور رفاہی شعبوں میں کیا کیا کام انجام دئے۔

اس اجتماع میں علاوہ دوسروں کے جناب صفدر حسین، شجاع الدین مجاہد، میر ایوب علی خاں، عزیز الرحمٰن اور اشرف فہیم نے شرکت کی۔

علم دار حسین۔ جدہ

ٹورنٹو

''یادگار جوش اکاڈیمی،، اور اخبار ''امروز،، ٹورنٹو (کینیڈا) کی مشترکہ مساعی سے دفتر امروز میں پچھلے دنوں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ یہ شعری نشست ڈاکٹر مظفر شکوہ کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی جو نیویارک سے ٹورنٹو تشریف لائے تھے۔ اس نشست کی کارروائی کا آغاز ''جوش اکاڈیمی،، کے صدر اختر آصف نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے کیا اور جمال زبیری سے مشاعرہ کی نظامت کے فرائض انجام دینے کی خواہش کی۔ جمال زبیری نے (جو ٹورنٹو کی دلچسپ اور جانی پہچانی شخصیت ہیں) رسمی شکریے کے بعد ڈاکٹر شکوہ سے مسندِ صدارت کو رونق بخشنے کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔ رات ساڑھے نو بجے مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ ساڑھے گیارہ بجے شب نصف گھنٹے کے وقفہ کے دوران امروز کے عابد رضوی، سید رضوی اور اختر آصف نے چائے اور دیگر لوازمات سے مہمانوں کی مدارات کی۔ دوسری نشست رات ۱۲ بجے شروع ہو کر ½۲ بجے رات کو ختم ہوئی۔ اس کامیاب اور سنجیدہ نشست میں جن مقامی شعراء نے حصہ لیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ ''اردو انٹرنیشنل،، کے مدیر اشفاق حسین ''رائٹرز فوم آف پاکستانی کینیڈین،، کے صدر عابد جعفری، اعجاز علی بزمی، آغا عبد الرحمٰن محشر، راقم الحروف (جوش مندوزئی) بیدار بخت، نزہت صدیقی، جمال زبیری، اطہر رضوی، اختر آصف، ڈاکٹر خالد سہیل، سلیم صدیقی، ریاض الوارث اور آئزک رہبر۔ آخر میں صدر مشاعرہ ڈاکٹر مظفر شکوہ صاحب کو بار بار سنا گیا۔

جوش مندوزئی۔ ٹورنٹو

قطر

قطر میں اردو مشاعروں کا آغاز اگست ۵۹ء میں ہوا۔ گذشتہ دنوں ''بزم اردو قطر،، کے تحت فائیو اسٹار ہوٹل

سونٹیل میں اردو مشاعروں کے پچیس برس پورے ہونے پر "سلور جوبلی مشاعرہ" ہوا جس میں معروف شاعر جناب محسن نقوی کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔ تقریب کی نظامت بزم کے جنرل سکریٹری ایم ممتاز راشد اور مشاعرے کی نظامت ممتاز افسانہ نگار شمیم حیدر نے کی۔

انجمن میں تشریف آوری

اردو کے مشہور مزاح نگار پروفیسر احمد جمال پاشا انجمن کے مرکزی دفتر میں تشریف لائے۔ انھوں نے انجمن کے قائم مقام شریک معتمد اور دیگر اسکالروں سے اردو زبان و ادب کے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کیا اور انجمن کے دونوں کتب خانے دیکھے۔

بھارتی ادیب پروفیسر احمد جمال پاشا کی اہلیہ پروفیسر سرور جمال بھی ان کے ساتھ تھیں۔

انجمن سے رخصت ہوتے وقت جناب و بیگم پاشا کو ادارے کے جرائد اور مطبوعات کا تحفہ پیش کیا گیا۔

شریک معتمد کی صحت یابی

انجمن ترقی اردو کے شریک معتمد پروفیسر شبیر علی کاظمی گزشتہ دنوں علیل ہو کر ہسپتال میں داخل ہو گئے تھے۔ علمی و ادبی حلقوں میں ــــ اس خبر سے لوگوں کو یقیناً اطمینان ہوگا کہ اب وہ صحت یاب ہو گئے ہیں اور پابندی سے دفتر آ رہے ہیں ــــ جن حضرات نے ان کی مزاج کے سلسلے میں خطوط لکھے تھے ادارہ ان تمام حضرات کا شکر گزار ہے۔

ناظم اعزازی کی واپسی، معتمد اعزازی کی روانگی

انجمن ترقی اردو پاکستان کے ناظم اعزازی جناب نورالحسن جعفری اور محترمہ ادا جعفری امریکہ کے دورے کے بعد وطن واپس آ گئے ہیں ــــ جبکہ معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی شمالی امریکہ کے دورے پر روانہ ہو گئے ہیں جہاں وہ مختلف مشاعروں اور مذاکروں میں شرکت کریں گے۔

سلہٹ میں اردو

مرتبہ: عبدالجلیل بسمل

قیمت ــــ چالیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی

پیش رفت

لوک ورثہ کی مطبوعات

وفاقی وزارتِ ثقافت وسیاحت کے تحت لوک ورثے کا ادارہ ایک تحقیقی ادارہ ہے جو ۱۹۷۴ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس ادارے نے لوک ادب اور صوفیانہ شاعری پر اب تک کوئی پینسٹھ (۶۵) کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ ذیل میں لوک ورثہ کا قومی ادارہ (پوسٹ بکس نمبر ۱۱۸۴ــــ اسلام آباد) کی مطبوعات کی فہرست درج ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مولف/مترجم	زبان	قیمت	تعارف
۱	کافیاں بلھے شاہ	عبدالمجید بھٹی	اُردو۔پنجابی	۳۲/- روپے	منظوم اردو ترجمہ
۲	کافیاں شاہ حسین	عبدالمجید بھٹی	اُردو۔پنجابی	۱۰/- روپے	منظوم اردو ترجمہ
۳	رحمان بابا	فارغ بخاری	پشتو۔اُردو	۱۵/- روپے	منظوم اُردو ترجمہ
۴	کہے فرید	شریف کنجاہی	پنجابی۔اُردو	۱۱/- روپے	منظوم اُردو ترجمہ
۵	من کے تارے	سید ضمیر جعفری	پنجابی۔اُردو	۷/- روپے	منظوم اُردو ترجمہ
۶	سائیں احمد علی پشاوری	رضا ہمدانی	پنجابی۔اُردو	۱۵/- روپے	منظوم اُردو ترجمہ
۷	ہیر دی ہیر	قیوم شاکر	پنجابی	۷/- روپے	منظوم اُردو ترجمہ
۸	چاربیتہ	رضا ہمدانی	ہندکو	۲۲/- روپے	مکمل انتخاب اردو ترجمہ
۹	دودو چنیسر	اقبال علی جتوئی	سندھی۔اُردو	۱۵/- روپے	منثور سندھی داستان
۱۰	سندھی لوک کہانیاں	اقبال علی جتوئی	اُردو	۱۲/- روپے	
۱۱	کشمیری لوک کہانیاں	طاؤس بانہالی	اردو	۱۲/- روپے	
۱۲	سرحد کی رومانی کہانیاں	خاطر غزنوی	اردو	۱۸/- روپے	
۱۳	براہوی لوک کہانیاں	عبدالرحمٰن براہوی	اُردو	۱۸/- روپے	
۱۴	پنجاب کے لوک کھیل	تنویر بخاری	اردو۔پنجابی	۱۸/- روپے	
۱۵	پنجاب میں پیدائش اور موت کی رسمیں	تنویر بخاری	پنجابی۔اُردو	۱۲/- روپے	

۱۶	لوک تماشے	عبدالغفور درشن	پنجابی۔اردو	-/۱۸ روپے	لوک تماشوں کا پہلا انتخاب اردو ترجمے کے ساتھ
۱۷	چلنجے چھتے	اے ڈی اعجاز	پنجابی۔اردو	-/۵ روپے	بار کے ڈھولوں کا اردو ترجمہ
۱۸	شنا کہاوتیں	محمد امین ضیاء	شنا۔اردو	-/۹ روپے	
۱۹	فوک لور کی پہلی کتاب	مظہرالاسلام	اردو	-/۶ روپے	فوک لور پر ریسرچ طریقۂ کار پر پہلی کتاب
۲۰	لوک پنجاب	مظہرالاسلام	اردو	-/۳۰ روپے	
۲۱	جنڈڑی	شاہین ملک	اردو۔پنجابی	-/۳۲ روپے	
۲۲	سچل سرمست	شفقت تنویر مرزا	اردو۔سندھی	-/۳۵ روپے	
۲۳	تاج محمد تاجل	عبدالرحمٰن براہوی	اردو۔براہوی	-/۹ روپے	منظوم اردو ترجمہ
۲۴	ٹپے	پرتو روہیلہ	اردو۔پشتو	-/۲۵ روپے	
۲۵	ماہیے	اسلم جدون	اردو۔پنجابی	-/۲۵ روپے	
۲۶	سی حرفی	انور بیگ اعوان	اردو۔پنجابی	-/۹ روپے	منظوم اردو ترجمہ
۲۷	دوہڑے شاہ شرف	ماجد صدیقی	اردو۔پنجابی	-/۹ روپے	منظوم اردو ترجمہ
۲۸	پوٹھوہار	عزیز ملک	اردو	-/۱۸ روپے	
۲۹	رشی نامہ	طاؤس بانہالی	اردو ترجمہ	-/۱۵ روپے	
۳۰	وھن ملوکی	انور بیگ اعوان	اردو۔پنجابی	-/۲۰ روپے	
۳۱	رزمیہ داستانیں	رضا ہمدانی	اردو۔پشتو	-/۳۵ روپے	
۳۲	بچوں کی کہانیاں	رضا ہمدانی	اردو	-/۲۰ روپے	
۳۳	ہاشم شاہ	شفقت تنویر مرزا	اردو۔پنجابی	-/۱۸ روپے	منظوم اردو ترجمہ
۳۴	مہر علی شاہ	کرم حیدری	اردو۔پنجابی	-/۱۵ روپے	منظوم اردو ترجمہ
۳۵	شاہ مراد	ماجد صدیقی	اردو۔پنجابی	-/۸ روپے	منظوم اردو ترجمہ
۳۶	عکسِ باہو	مسعود قریشی	اردو۔پنجابی	-/۲۰ روپے	منظوم اردو ترجمہ
۳۷	لوک داستانیں	آغا سلیم	اردو	-/۱۸ روپے	
۳۸	من میلہ	ضمیر جعفری، کلام میاں محمد	اردو۔پنجابی	-/۳۵ روپے	منظوم اردو ترجمہ

۳۹	لوک	شفقت تنویر مرزا	اُردو۔پنجابی	-/۲۵ روپے	علی حیدر کے کلام کا ترجمہ
۴۰	لوریاں	راجا رسالو	اردو۔پنجابی	-/۱۴ روپے	
۴۱	داریں	سجاد حیدر	اُردو	-/۱۹ روپے	
۴۲	بولیاں	عبدالغفور درشن	اُردو۔پنجابی	-/۱۴ روپے	
۴۳	خوش حال خان خٹک	خارغ بخاری	اُردو۔پشتو	-/۲۲ روپے	خوش حال خان خٹک کے کلام کا اُردو ترجمہ
۴۴	پٹھانوں کے رسم ورواج	رضا ہمدانی	اُردو۔پشتو	-/۲۵ روپے	
۴۵	گوجری پہاڑی گیت	غلام حسین	پنجابی۔اُردو	-/۳۲ روپے	
۴۶	باباشیر	غلام عمر	اُردو	-/۱۸ روپے	
۴۷	چترال کی لوک کہانیاں	غلام عمر	اُردو	-/۲۰ روپے	
۴۸	مرزا صاحباں	حافظ برخوردار	پنجابی	-/۶۵ روپے	
۴۹	سخن کے وارث	لیئق بابری	اُردو	-/۱۶ روپے	

FOLK TALES FROM UPPER INDUS	IFH	RS 95/
PUSHTO FOLK STORIES	F. H. MALYON	Rs. 10/-
FESTIVALS AND FOLKLORE OF GILGIT	GHULAM MOHAMMAD	Rs. 15/-
FOLK HERITAGE OF PAKISTAN	UXI MUFTI	Rs. 35/-
CATALOGUE	IFH	Rs. 30/-
BIBLIOGRAPHY OF FOLKLORE	IQBAL JATOI	Rs. 30/-
DIRECTORY OF CULTURAL INSTITUTIONS	UXI MUFTI	Rs. 25/-
BALOR AND DARDISTAN	KARL JETTMAR	Rs. 15/-
GULISTAN	FRANCIS GLADWIN	Rs. 35/-

WHO IS WHO FOR IFH	IQBAL JATOI	Rs. 10/-
THE LEGENDS OF THE PUNJAB VOL. I	CAPTAIN R.C. TAMPLE	Rs. 99/-
THE LEGENDS OF THE PUNJAB VOL. II	CAPTAIN R.C. TAMPLE	Rs. 90/.
KASHMIRI FOLK TALES	REV. J. HINTON KNOWELS	Rs. 95/-
FOLK TALES FROM HUNZA	LT. COL. DLR. LORIMER	Rs. 35/-
TILE WORK IN PAKISTAN	SAJJAD HAIDER	Rs. 150/-
ROCK CARVING AND INSCRIPTIONS	KARL JETTMAR	Rs. 25/-
BUDDHISTIC KINGDOMS	FAMES LEGGE	Rs. 30/.

سعید اے خان۔ ڈپٹی ڈائرکٹر

طنزیات و مقالات

از

سید محفوظ علی بدایونی

مؤلف

محمد محی الدین بدایونی، بی اے

قیمت: ۲۰ روپے

انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ کراچی

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

انتخاب از کلام المعارف

مصنف: جناب حافظ سید شاہ محمد فضل المتخلص بہ ساقیؔ بریلوی

ناشر: سید محمد رضا

۲/۸۰ الیس، پی۔ای۔سی۔ایچ سوسائٹی کراچی

یہ کتاب جناب حافظ سید شاہ محمد فضل غوث قادری المتخلص بہ ساقی کے کلام کا انتخاب ہے۔ حضرت ساقی کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے جو شہرت کی دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں اور طریقت کے رازداں اور بحر شریعت کے ماہر شناور ہوتے ہیں۔ ان کمالات کے ساتھ ساتھ حضرت ساقی ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ وہ فارسی اردو اور ہندی کے شاعر ہیں اور ان کے کلام سے پختگی اور کہنہ مشقی کا پتا لگتا ہے۔ انتخاب کلام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ شاہ صاحب کے پورے کلام میں بنیادی خیال ذاتِ خداوندی، رسولؐ اکرم اور تصوف کے مسائل ہیں۔ کلام میں آورد کہیں نظر نہیں آتی۔ سارا کا سارا کلام جذبات، واردات اور مشاہدات کی ایک تصویر ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں، دیکھتے ہیں وہ ایک کہنہ مشق ماہرِ فنِ شعر کی طرح نظم کر دیتے ہیں مثال کے طور پر یہ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مجھ میں اور تجھ میں بھلا پردہ، ہجراں کب تھا
میں ترے سامنے تھا مجھ سے تو پنہاں کب تھا

دید کا وعدہ ہے گو حشر کے دن کا لیکن
کہتے ہیں حشر تو اک پل کا تماشہ ہوگا

خدا کا محرم اسرار ہے اگر جبریل
رسول کا بھی تو صدیق یار غار آیا

میزانِ خدائی میں سبھی ہوتے برابر
چھوٹوں کی ترازو میں جو پاسنگ نہ ہوتا

در حالت گدائی مارا است بادشاہی
ایں شاہی و گدائی بخشید عشق مارا

با خلق حق خدمت بانفس خود عداوت
کافی است ایں نصیحت اے دوستاں شمارا

جناب سید محمد رضا قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے یہ انتخاب شایع کرا کے قارئین کو مطالعے کا موقع فراہم کیا اور کتابی شکل میں لا کر محفوظ کر دیا۔ کتابت و طباعت خوب ہے اور گیٹ اپ اچھا ہے۔

توقیر صدیقی

مولانا شمس الحق عظیم آبادی (حیات اور خدمات)

مصنف : محمد عزیر

ناشر : علمی اکیڈمی ۶۶۷ دستگیر کالونی۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی ۳۸

صفحات : ۱۴۴

قیمت : ۳۵ روپے

برصغیر میں علم حدیث کی ضرورت و اہمیت کو سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے جانا اور اس کی اشاعت کی کوشش کی لیکن ان کی تحریک کو زیادہ وسعت حاصل نہ ہوسکی۔ ان کی رحلت کے پچاس، ساٹھ سال بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ پیدا ہوئے۔ انہوں نے اس علم کو نہایت باقاعدگی سے سیکھا اور پھر تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ اس کو آگے بڑھایا۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم کا قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ، تشنگانِ علم کے لیے چشمۂ حیات کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہاں دور دور سے طلبہ آتے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ اور آپ کی اولاد و احفاد حدیث کا علم ان کو منتقل کرتے تھے۔ یہ فیض عرصہ تک جاری رہا اور آج علم حدیث جس طرح برصغیر میں پھیل رہا ہے یہ سب بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ کا فیضان ہے۔

خانوادۂ ولی اللہی میں حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب کے تلامذہ میں دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک گروہ حدیث کو فقہ حنفی کی تائید و توثیق کے لیے استعمال کرتا اور اس میں رائے اور تاویل سے کام لیتا تھا۔ دوسرے گروہ کا مقصد فقہی مسائل کو براہِ راست حدیث سے اخذ کرنا تھا اور کسی فقہی دبستان کا قائل نہیں تھا۔ اس دوسرے گروہ کے سرخیل میاں نذیر حسین تھے۔ انھوں نے خود علم حدیث کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ کئی ایسے تلامذہ تیار کئے جنھوں نے اس کام کو کافی آگے بڑھایا۔ ان تلامذہ میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے علم حدیث کی بڑی خدمات انجام دیں اور صحاح ستہ پر شروح، تعلیقات اور حواشی لکھنے کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے سنن ابی داؤد کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک غایتہ المقصود فی سنن ابی داؤد اور دوسری عون المعبود علی سنن ابی داؤد۔ مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کا ارشاد ہے کہ "یہ دونوں شرحیں اس پایہ کی ہیں کہ آٹھویں صدی ہجری کے کسی محدث و محقق کی تالیف معلوم ہوتی ہیں۔"

اِن دو شرحوں کے علاوہ حضرت مولانا شمس الحق کا حدیث میں بڑا کام ہے۔ اگر آپ کی عمر کو جو تقریباً ۵۶ سال ہوتی ہے، سامنے رکھیں اور آپ کے کاموں کا جائزہ لیں تو یہ سب کچھ آپ کی کرامت معلوم ہوگی۔

ایک ایسی نابغۂ روزگار ہستی کی حیات اور اس کے کارنامے اس قابل تھے کہ ان سے لوگوں کو واقفیت دلائی جائے۔ کتاب زیرِ تبصرہ اسی غرض سے لکھی گئی ہے۔ پہلے یہ کتاب عربی میں تھی پھر اضافوں کے ساتھ اردو میں منتقل کر دی گئی۔ اسی سلسلہ میں حضرت مولانا شمس الحق کی کئی فراموش شدہ تالیفات بھی جو کنجِ خمول میں پڑی ہوئی تھیں اب منظرِ عام پر آگئی ہیں۔

اس کتاب میں حضرت مولانا کے حالاتِ زندگی کے علاوہ تین موضوعات پر خصوصیت سے بحث کی گئی ہے۔ یہ موضوعات آپ کی تالیفات، فتاویٰ اور خطوط ہیں۔

کتاب مختصر مگر نہایت جامع ہے اور مولانا کی وسعت معلومات اور تحقیقی اور تصنیفی صلاحیتوں پر دلالت کرتی ہے

علمی اکیڈمی کراچی اس کی اشاعت پر تبریک کی مستحق ہے۔

ثناء الحق صدیقی

دفتری اُردو (برائے افسران وفاقی حکومت)

ناشر : علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔ اسلام آباد

صفحات : ۲۱۲

قیمت : ۳۰ روپے

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب پاکستان کی وفاقی حکومت کے افسران کی رہبری و رہنمائی کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ پوری کتاب چھ یونٹوں میں منقسم ہے جن کے عنوانات ترتیب وار یہ ہیں (۱) دفتری زبان اور اسلوب (۲) دفتری مراسلت اور اس کی اقسام۔ (۳) مسل اور مسل داری (۴) خلاصہ نگاری (۵) روداد نویسی (۶) فرہنگ دفتری اصطلاحات۔ ہر عنوان پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور کام کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے کچھ اصول بتائے گئے ہیں۔ صحیح اور غلط اور مناسب اور نامناسب کے فرق کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ انداز تحریر ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ عوام و خواص ہر بات کو نہایت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ جس طرح ابہام اور ژولیدگی سے بچنے کا دوسروں کو مشورہ دیا گیا ہے اسی طرح مرتبین کتاب نے بھی اپنا دامن ان کوتاہیوں سے بچایا ہے۔ اعتدال اور توازن اس کتاب کی اہم خصوصیت ہے چنانچہ جہاں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال کو کم کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے وہاں انگریزی الفاظ کے بے جا استعمال سے بھی روکا گیا ہے۔ جو الفاظ عام طور پر رائج ہیں اور جن کو ہر شخص سمجھتا ہے ان کو یک لخت چھوڑ دینے کی جگہ بتدریج ترک کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے اور یہ نہایت صائب رائے ہے۔ مثلاً اس طرح لکھنا مناسب نہیں۔

"اکاموڈیشن کی الاٹمنٹ کے آرڈر ایشو ہوگئے ہیں"

بلکہ اس بات کو یوں کہنا درست ہے۔ "مکان کی الاٹمنٹ کے احکام جاری ہوگئے ہیں" ——— فی الحال لفظ الاٹمنٹ کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ لفظ رائج اور جاری ہے۔

دوسرے یونٹ میں مراسلت کی اقسام بتا کر ان کے اصول اور نمونے دے دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح باقی عنوانات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور مثالوں اور نمونوں سے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔

آخری یونٹ میں جو دفتری اصطلاحات کی فرہنگ پر مشتمل ہے دو فہرستیں دی گئی ہیں۔ پہلی فہرست میں اُردو کے مقابل میں انگریزی اور دوسری میں انگریزی کے مقابل اُردو اصطلاحات درج ہیں۔

اگرچہ پوری کتاب ایک اچھے گائیڈ کی حیثیت رکھتی ہے پھر بھی پہلے یونٹ کے تعارف میں یہ اہم حقیقت بیان کر دی گئی ہے کہ

"اصل دفتری زبان اور اس کا کامیاب دفتری روپ وقت کے ساتھ ساتھ خود دفتروں میں ابھرے گا"

خدا کرے وہ دن جلد آئے جب تمام دفتروں میں یہ زبان رائج ہو اور اصل دفتری زبان کے نمونے ہمارے سامنے آئیں۔ کتاب زیر تبصرہ ایک بڑی اچھی اور کامیاب پیش کش ہے جس کے لیے مرتبین کتاب لائق ستائش ہیں۔

ثناء الحق صدیقی

آتشِ احساس

مصنف : فدا خالدی

ملنے کا پتہ : بزم یوسفی ۔ ۳۴۳/ ا ے بلاک نمبر ۱ فیڈرل بی ایریا ۔ کراچی

قیمت : پندرہ روپے

"آتشِ احساس"، فدا خالدی کی غزلیات و قطعات کا مجموعہ ہے ۔ اس سے قبل ان کے دو شعری مجموعے "آتشِ خوابیدہ" اور "م ۔ ص"، کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ۔

فدا خالدی ایک کہنہ مشق اور صاحب تلامذہ شاعر ہیں ۔ خود حضرت بیخود دہلوی جانشین داغ دہلوی کے شاگرد ہیں ۔ اور کتاب کا انتساب بھی ایک لائق شاگرد کی طرح اپنے استاد محترم کے نام کیا ہے ۔ قدیم رنگ میں شعر کہنے کی وجہ سے ان کی شاعری بھی اپنے استاد مرحوم کے لب و لہجہ سے ہم آہنگ ہے ۔ اس بارے میں "گفتنی"، کے عنوان کے تحت عزیز احسن نے لکھا ہے کہ "آتشِ احساس" کی شاعری محض تسکین خاطر کے لیے تخلیق نہیں ہوئی اسی لیے آج کے شعری روّیوں کی کامل آگاہی رکھنے کے باوصف شاعر نے رائج الوقت لہجہ اپنانے کی کوشش نہیں کی" ـــــــــ اس وضاحت کے بعد ان کی شاعری کے متعلق مزید کچھ لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔

کتابت میں غالباً کاتب صاحب نے اپنی "خود اعتمادی"، سے کام لیتے ہوئے جس انداز میں چاہا غزلوں کی کتابت کر ڈالی ہے ۔ لہٰذا ایک انداز سے لکھی ہوئی غزلیں نہیں ملتی ہیں ۔ اسی طرح طباعت بھی ہے ۔ یعنی کہیں کہیں سے حروف اڑے ہوئے ہیں ۔ بہرحال یہ بھی کیا کم ہے کہ شاعر کی بے نیازی نے ان کے احباب اور تلامذہ کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ ان کے کلام کو ترتیب دے کر شائع کر دیں ۔

چھوٹے سائز پر چھپی ہوئی اس کتاب کی قیمت مناسب ہے ۔

اطہر نادر

ہمدرد نونہال (خاص نمبر)

ہمدرد فاؤنڈیشن ، پاکستان

ضخامت : ۳۰۴ صفحات

قیمت : ۱۰ روپے

ہمدرد نونہال برصغیر پاک و ہند میں بچوں کے لیے شائع ہونے والے چند معیاری رسائل میں ایک منفرد اور اعلا مقام رکھتا ہے ۔ سال گزشتہ کی طرح اس سال بھی اس کا خاص شمارہ اشاعت پذیر ہوا ہے ۔ اس شمارے میں شامل تمام مضامین معیاری ہیں ۔ بچوں کے لیے اچھی کہانیاں چُنی گئی ہیں ۔

بچوں کے لیے لکھنا ایک نہایت مشکل کام ہے ، لیکن گزشتہ ۳۲ سال سے شائع ہونے والے اس رسالے نے ثابت

کرتا ہے کہ اگر کوئی کام لگن اور محنت سے کیا جائے تو وہ ضرور پورا ہوتا ہے۔ جناب حکیم محمد سعید کی ذاتی دلچسپی سے شائع ہونے والا یہ رسالہ پاکستانی بچوں کے لیے صحت مند ادب اور روشن تحریریں فراہم کرنے میں پوری طرح کامیاب رہا ہے۔

زیرِ تبصرہ شمارے کے لیے جو تحریریں منتخب کی گئی ہیں ان میں مندرجہ ذیل نامور ادیبوں کی تخلیقات شامل ہیں: عبدالواحد سندھی، ملا واحدی، حسین حسان، مرزا ادیب، کرشن چندر، علی ناصر زیدی، حکیم محمد سعید اور مسعود احمد برکاتی۔ یہ نام اس شمارے کے معیاری، دل چسپ اور معلومات افزا ہونے کا ثبوت ہیں۔

ہمدرد نونہال کا یہ شمارہ اس اعتبار سے نہایت متوازن اور عمدہ ہے کہ اس میں بچوں کی ذہنی اور فکری جلا کا بھرپور اہتمام کیا گیا ہے۔ مشاہیر کے حالاتِ زندگی، مہم جوئی، ادب کے شہ پارے، سائنسی معلومات، خوبصورت کہانیاں، فکر انگیز مضامین، طبّی مشورے اور خود نونہالوں کی اپنی قلمی کاوشیں اس شمارے کی زینت ہیں۔ اس شاندار شمارے کی اشاعت پر جناب حکیم محمد سعید اور جناب مسعود احمد برکاتی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یقین ہے کہ یہ رسالہ اپنی قائم کردہ روایات کے مطابق پاکستانی بچوں کے لیے اخلاقی اور ذہنی تربیت کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہوگا۔

ادارہ

سحرِ رنگ

مصنف : حسرت کاظمی

ناشر : ادارہ فروغ اردو۔ ای۔ ۳/۴۴ جہانگیر روڈ شرق۔ کراچی

قیمت : ۳۰ روپے

حسرت کاظمی پرانے شاعر ہوتے ہوئے اس دور کی نئی آوازوں میں شامل ہیں۔ ان کی آواز میں ایک درد ہے۔ ایسا درد جو خود دوا بھی ہے۔ گویا نامساعد حالات کی بے یقینی میں گم ہونے سے اپنی ذات کو بچا لیا ہے۔ غزلوں میں موضوعات کا تنوّع ان کے جذبۂ خلاقیت کی دلیل ہے۔ انہوں نے روایت سے بھی بغاوت نہیں کی ہے اور جدیدیت کے نام پر بے راہ روی اختیار کرنے سے بھی گریز کیا ہے۔ یہی ان کا مزاج ہے جو ان کے کلام کی روح ہے۔ الفاظ و معانی کے لطیف پردوں میں انہوں نے حیات و کائنات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی ادبی خلاقی، حسنِ بیکراں اور جاذبیتِ فراواں لئے ہوئے ہے۔ وہ عشق اور ہوس میں امتیاز کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ "سحرِ رنگ" مہذب غزلوں کا مجموعہ ہے۔ مجھے "سحرِ رنگ" پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ اسلوب اور فکر کی یگانگت و ہم آہنگی کے خاصی حد تک قائل ہیں۔ ان کے ہر لفظ کا چہرہ حقیقت اور عقلیت کی ضو پاشیوں سے منور ہے اور استعاروں اور تشبیہوں کا استعمال خال خال ملتا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ سلیس اور سادہ ہو۔ ایک خاص بات یہ کہ ان کے کلام میں ابہام نہیں پایا جاتا ہے۔ ان کی ذات کی طرح ان کی غزلیں اور نظمیں بھی سادہ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اہلِ علم اس مجموعے کی فراخ دلی سے پذیرائی کریں گے۔

ڈاکٹر نعیم نقوی

ارکانِ اسلام

مصنف : مولانا اشرف علی قریشی

ناشر : ادارۂ موتمر المولفین جامعہ اشرفیہ پشاور

ہدیہ : ۵۰ روپے

"ارکانِ اسلام"، ایک جامع تالیف ہے جس میں مولانا اشرف علی قریشی صاحب نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ نماز، روزہ، حج زکوٰۃ اور دیگر ارکان کے علاوہ اس کتاب میں مختلف موضوعات مثلاً مسنون دعائیں، جمعہ کی فضیلت، احادیث پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والثنا، خطبات سرکار ختمی مآب، مقدمی مقامات کا تفصیلی ذکر اور تاریخی حالات و حوالہ جات، اسلامی مہینوں کے فضائل اور اعمال وغیرہ ہیں۔ ۷۶۶ صفحات پر مشتمل کتاب ایک بے بہا خزینہ ہے۔ مولانا موصوف نے اپنے مسلک کے مطابق کثیر تعداد میں واجبات و سنن کی ادائیگی پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عربی فارسی میں تو ایسی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اردو زبان میں اب تک لکھی جانے والی کتابوں میں ہر اعتبار سے اس کتاب کو جامعیت کے سبب ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ مولانا کی یہ سعیٔ مشکور لائقِ صد ہا ستائش ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے افراد اس کتاب سے یقیناً استفادہ کر سکتے ہیں۔ میں مولانا اشرف علی قریشی صاحب کو اس دل پذیر اور ایمان افروز تالیف پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور بارگاہِ ایزدی میں دعاگو ہوں کہ انھیں تا دیر خدمتِ دینی کا موقع دے اور دیگر حضرات ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس کام کو آگے بڑھائیں۔

ڈاکٹر نعیم تقوی

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

تصنیف : نظامی دکنی ——— قیمت : پچیس روپے

مرتبہ : ڈاکٹر جمیل جالبی

خصوصی ایڈیشن : پچاس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی

حروفِ تازہ

کتابیں

○ مقالات ترتیب وانتخاب : خالدہ حسین

صفحات ۲۰۰ قیمت درج نہیں

ناشر : نیشنل بک کونسل آف پاکستان۔ اسلام آباد (پاکستان)

○ میں اور میں (شاعری) مصنف : غلام جیلانی اصغر

صفحات : ۱۶۰ قیمت : ۳۵ روپے

ناشر : آئینۂ ادب۔ چوک انارکلی۔ لاہور (پاکستان)

○ زوال سلطنت مغلیہ۔ مصنف : ثناء الحق صدیقی

صفحات : ۷۸ قیمت : درج نہیں

ناشر : ادارہ دانش وحکمت۔ ۱۳ ڈی بلاک بی۔ نارتھ ناظم آباد کراچی (پاکستان)

○ پس دیوار (افسانے) مصنف : عبد الصمد

صفحات : ۱۲۰ قیمت : ۲۰ روپے

ناشر : کلچرل اکیڈمی۔ جگ جیون روڈ۔ گیا (بھارت)

○ شمع اور دریچہ (مضامین) مصنف : محمد ابن الحسن سیّد

صفحات : ۱۶۰ قیمت : ۳۵ روپے

ناشر : مکتبۂ راول رویل۔ راولپنڈی (پاکستان)

○ سرد لہو کا نوحہ (افسانے) مصنف : نذر الحسن صدیقی

صفحات : ۲۵۴ قیمت : ۳۰ روپے

ناشر : مکتبۂ نیا دور۔ کراچی ۵ (پاکستان)

○ جھولٹوں کی بستی (بچوں کے لیے) مصنف : صفیہ ملک

صفحات : ۳۰ قیمت : ۴٫۵۰ روپے

ناشر : شیخ شوکت علی اینڈ سنز۔ ایم۔ اے جناح روڈ۔ کراچی (پاکستان)

○ سندھی بولنے والے سندھی اردو بولنے والے سندھی مصنف : انور عباس نقوی

صفحات : ۹۶ قیمت : چار روپے پچاس پیسے

ناشر : شاہین پبلشرز ۔ ۳۴ ۔ ایس ۔ سی ۔ چاندنی چوک ، اسٹیڈیم روڈ ۔ کراچی (پاکستان)

o دوہے (شاعری) مصنف : جمیل الدین عالی

صفحات : ۸۸ قیمت : ۱۲ روپے

ناشر : مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ ۔ نئی دہلی (بھارت)

جریدے

o ہفت روزہ "ساربان" ایڈیٹر : ملک محمد رمضان بلوچ

۶ اکتوبر ۱۹۸۴ء ۔ صفحات : ۴ قیمت : درج نہیں

پتہ : ہفت روزہ ساربان ۔ مستونگ (پاکستان)

o ماہنامہ "سکھی گھر" اعزازی مدیر اعلیٰ : اشفاق احمد

اگست ۸۴ء ۔ صفحات : ۳۲ قیمت : ۵۰ پیسے

پتہ : ۱۳ اے ٹمپل روڈ ۔ لاہور ۔ (پاکستان)

o پندرہ روزہ "صحیفۂ اہلِ حدیث" مدیر مسئول : کرم الجلیلی

اوائل نومبر ۸۴ء ۔ صفحات : ۳۲ قیمت : دو روپے

پتہ : مولانا عبدالرحمٰن سلفی ۔ محمدی مسجد اے ۔ ایم ۱ے کراچی (پاکستان)

o سہ ماہی "اقبال ریویو" مدیر : پروفیسر محمد منوّر

جولائی ۸۴ء ۔ صفحات : ۲۲۴ قیمت : دس روپے

پتہ : اقبال اکادمی پاکستان ۔ ۱۱۶ میکلوڈ روڈ ۔ لاہور (پاکستان)

o ماہنامہ "نئی قدریں" مدیر : اختر انصاری اکبر آبادی

اگست ستمبر ۸۴ء صفحات : ۱۴۴ قیمت : سات روپے

پتہ : پوسٹ بکس ۸۵ بھائی خاں کی چاڑھی ۔ حیدر آباد (پاکستان)

o سہ ماہی "صدف" مدیر : کفیل احمد

اپریل تا ستمبر ۸۴ء ۔ صفحات : ۶۴ قیمت : درج نہیں

پتہ : شعبۂ تعلقات عامہ ۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ ۔ کراچی (پاکستان)

o مجلۂ تحقیق مجلسِ ادارت : ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

جلد ۵ شمارہ ۲ ، ۳ ، ۴ ۔ صفحات ۱۳۸ قیمت : دس روپے

پتہ : کلیۂ علوم اسلامیہ وادبیات شرقیہ ۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور (پاکستان)

o ماہنامہ "ضیائے حرم" مدیر اعلیٰ : امین الحسنات شاہ

نومبر ۸۴ء - صفحات : ۹۶ قیمت : ۵ روپے

پتہ : ۴/۱۲۴/۱۱ شاداب کالونی - علامہ اقبال روڈ - لاہور (پاکستان)

٥ ماہنامہ "یارانِ وطن" ایڈیٹر : ضیاء اقبال شاہد

نومبر ۸۴ء - صفحات : ۵۴ قیمت : درج نہیں

پتہ : نمبر ۱۶ گلی نمبر ۱ الیف ۸/۳ اسلام آباد (پاکستان)

٥ ماہنامہ "حور" مدیرہ : امۃ اللہ قریشی

نومبر ۸۴ء - صفحات : ۹۶ قیمت : ۶ روپے

پتہ : ا - بی - ۳۸ گلبرگ III نزد غالب مارکیٹ - لاہور (پاکستان)

٥ ماہنامہ "اظہار" مدیر : کریم بخش خالد

ستمبر ۸۴ء - صفحات : ۷۲ قیمت : درج نہیں

پتہ : سندھ سنٹر - اسٹریچن روڈ - کراچی نمبر ۱ (پاکستان)

٥ ماہنامہ "میثاق" مدیر مسئول : ڈاکٹر اسرار احمد

نومبر ۸۴ء - صفحات : ۹۶ قیمت : ۳ روپے

پتہ : ۱۱ داؤد منزل - نزد آرام باغ - شاہراہِ لیاقت - کراچی (پاکستان)

٥ پشاور یونیورسٹی جرنل (السنہ) مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

شمارہ نمبر ۲ صفحات : ۱۵۰

پتہ : پشاور یونیورسٹی - پشاور (پاکستان)

٥ سہ ماہی "توحید"

جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۲ صفحات : ۱۸۴ قیمت : درج نہیں

پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۵۸۱۵/۲۱۹۵ - تہران (ایران)

٥ الجمن مدیر اعلیٰ : ریاض الیسین احمد

جولائی، اگست ۸۴ء - صفحات : ۲۴ قیمت : ایک روپیہ

پتہ : ۸۰ - ڈی - باب الاسلام پریس - ناظم آباد - کراچی (پاکستان)

٥ ماہنامہ "الزکوٰۃ" مدیر : پروفیسر کرم حیدری

اکتوبر ۸۴ء - صفحات : ۲۴ قیمت : دو روپے

پتہ : دفتر نیشنل پریس ٹرسٹ - مکان نمبر ۷ گلی نمبر ۶۰ الیف ۶/۳ اسلام آباد (پاکستان)

علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر لکھی جانے والی پہلی کتاب

اقبال

مصنفہ :- احمد دین (مصنف سرگزشت الفاظ)
مرتبہ :- مشفق خواجہ

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئی تھی اور اس ایڈیشن کے تمام نسخے جلا دیئے گئے تھے۔ دوسری مرتبہ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ شایع ہوئی تھی۔ نئے ایڈیشن میں متن ۱۹۲۶ء کے ایڈیشن پر مبنی ہے اور ۱۹۲۳ء کے ایڈیشن کے تمام حذف شدہ مباحث اور اختلافات کو کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں مرتب نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں احمد دین کے حالات زندگی، ادبی کاموں اور علامہ اقبال سے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

صفحات :- ۵۲۸
قیمت :- ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی

ردعمل

محترم جناب حیدر ملک صاحب

السلام علیکم ۔ مزاج گرامی ؟

ماہنامہ "قومی زبان" بلاتاخیر مل رہا ہے جس کے لیے شکریہ قبول فرمائیں۔ ماہ جون کے شمارہ میں محترم خسروی صاحب کا ایک مضمون "مصوری درسی قاعدہ" نظر سے گزرا۔ خیال آیا کہ جناب خسروی صاحب نے آج سے ٹھیک دو سال قبل یعنی جون ۸۲ء کے اخبار اردو میں بھی اسی قسم کا ایک مضمون تحریر کیا تھا جس میں اردو حروف تہجی کے ۱۵ ویں حرف "ڑ" سے متعلق ایک لفظ "ڑیڈھی" جو خود بقول موصوف کے صحیح لفظ "ریڈھی" ہے بچوں کے قاعدہ میں مصوّر کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ احقر نے بھی اپنے خیالات کے اظہار کے لیے "اخبارِ اردو" میں ایک مضمون برائے اشاعت دیا تھا جو ماہ ستمبر ۸۲ء کے شمارہ میں شامل اشاعت ہوا۔ میں جناب خسروی صاحب کی اس کوشش و کاوش سے بہت متاثر ہوں کہ وہ اردو میں اس کمی کی طرف اکثر و بیشتر اصحاب کی توجہ دلاتے رہتے ہیں۔ اور اسی مقصد سے انھوں نے ایک بار پھر آکسفورڈ یونیورسٹی کی ایک کتاب (J.T. PLITTS) کے حوالے سے ایک لفظ "ڑوڑا" دریافت کیا ہے جس کو موصوف چاہتے ہیں کہ درسی قاعدہ میں شامل کیا جائے لیکن گستاخی معاف، یہ بے معنی لفظ غالباً کسی انگریز کی زبان سے ادا ہو کر اسی کے لہجہ میں چھپ گیا ہوگا۔ میں حیران ہوں کہ "ڑوڑا" کیا شے ہے اور اس لفظ کو کن معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اس لفظ کے معنی اور مفہوم کی کوئی تشریح فاضل مصنف نے نہیں کی۔ "قومی زبان" کے توسط سے اصحابِ اقتدار سے تعاون کی اپیل کے ساتھ عرض کرنا ہے کہ اردو ڈکشنری بورڈ یا مقتدرہ یا بلدیہ عظمیٰ ملک کے کسی حصے میں کسی نئی سڑک، نئی عمارت یا نئی منڈی کا نام حرف "ڑ" سے شروع ہونے والے کسی لفظ پر رکھ دے۔ مثلاً ڑ والی سڑک، ڑ والی بلڈنگ یا ڑ منڈی وغیرہ۔ نیز مصنوعات تیار کرنے والے ادارے اپنے کسی نئے (PRODUCT) کا نام حرف ڑ سے شروع کر دیں۔ میں نے اکثر ایسے الفاظ سنے ہیں جن میں ڑ پہلے استعمال کی گئی ہے۔ بالعموم یہ الفاظ "ر" کے تلفظ سے بولے جاتے ہیں مگر ان میں وہ زور اور کشش نہیں ہوتی جتنی کہ "ڑ" کو لفظ کے شروع میں لگانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اردو زبان کا یہ بھی ایک کمال ہے کہ جہاں یہ انگریزی اور دوسری زبانوں کے الفاظ سمیٹ رہی ہے وہاں غیر معروف بے معنی اور غیر دل چسپ الفاظ خود بھی پیدا کر رہی ہے انہیں میں ایک لفظ ڑید، ڑیڈھ، یا ریڈھ ہے۔ ڑیڈھ یا ریڈھ کوئی عربی، فارسی، انگریزی فرانسیسی، جرمنی، چینی، ترکی یا کسی اور زبان کا لفظ نہیں بلکہ یہ اردو کی ایجاد ہے جو کسی ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے

جس سے کوئی کام خراب ہو جائے۔ مثلاً۔ جناب آپ نے تو اس کام کی ڈیڑھ (زیڑھ) لگادی۔

اس قسم کا ایک اور لفظ گجراتی حضرات اردو بولتے وقت استعمال کرتے ہیں "ڈوکرا" جو دراصل "روکڑ" ہے۔ بہرحال ایسے الفاظ کو اردو لغت میں شامل کر لینا چاہیئے۔ مصنوعات کے ناموں کی مثالیں ایسی ہیں جیسے رفان انرجائل اگر اس کو ٹرفان انرجائل کر دیا جاتا تو اس بے معنی لفظ میں معنی تو پھر بھی پیدا نہیں ہوں گے مگر ایک لفظ تو مل جائے گا۔ اسی طرح رکسونا صابن کو اگر ڈکسونا کر دیا جائے تو اس میں ایک کشش پیدا ہو جائے گی۔

حبیب صدیقی ۔ کراچی

مکرمی و محترمی عالی صاحب السلام علیکم

"قومی زبان" اپنی ظاہری و معنوی ترقی کے ساتھ چند مہینوں سے مل رہا ہے۔ "غیر ترقی یافتہ" صورت میں بھی باقاعدہ مل رہا تھا۔ جناب اختر حسین صاحب کی اردو زبان سے محبت کا علم تو مجھے بہت مدت پہلے سید آغا حسین ارسطو جاہی مرحوم و مغفور کے توسط سے ہو چکا تھا لیکن جب "قومی زبان" ان کی آمد کے بعد کاغذ، کتابت و طباعت اور بعض دوسرے معاملات میں انحطاط کی طرف مائل ہوا تو میرا خیال تھا کہ جناب ایوب نے ایک بیورو کریٹ کو "احدی" کے طور پر انجمن پر مسلط کر دیا ہے تاکہ یہ پنپنے نہ پائے۔ "اختر حسین نمبر" دیکھ کر پتہ چلا کہ میں سخت غلطی پر تھا۔ ان کے متعلق آپ کا مضمون حقیقت نگاری اور محبت و عقیدت کا شاہکار ہے۔ صرف یہ مضمون پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ مرحوم و مغفور انجمن کے لیے کیا کچھ کر گئے ہیں۔ اور وہ کتنے مخلص اور دردمند اور منکسر المزاج بزرگ تھے۔ خدا ان کے مراتب بلند کرے۔

آپ نے جب سال دو سال پہلے "مقتدرۂ قومی زبان" کے ارکان کو چائے کی دعوت دی تھی، میں بھی اس میں شامل تھا اور میں نے آپ کو بتایا تھا کہ "قومی زبان" تو مل رہا ہے مگر "اردو" کسی وجہ سے میرے نام بند کر دیا گیا ہے۔ آپ نے اس پر تعجب کا اظہار کر کے "اردو" بھی میرے نام دوبارہ جاری کر دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ اگر "اردو" جاری ہے تو وہ اب بھی میرے نام نہیں آتا۔ "قومی زبان" جب ملتا ہے تو یہ مصرع یاد آ جاتا ہے:

؎ میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

اس کا پہلا مصرع نہ یاد ہے، نہ یاد آتا ہے

حامد علی خاں ۔ لاہور

محترمی و مکرمی جناب عالی صاحب السلام علیکم

گزشتہ تین برس سے "قومی زبان" کا قاری ہوں۔ لیکن اب کے برس جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اس میں آپ حضرات اور ادا جعفری صاحبہ، بشیر علی کاظمی صاحب کی مساعی جمیلہ نے "قومی زبان" کو خوب سے خوب تر بنانے میں جو کردار ادا کیا ہے

تاریخ اردو ادب انھیں فراموش نہ کر سکے گی۔ تعارف، شخصیات، گوشۂ طلبہ، گلہائے رنگ رنگ اور نئے خزانے سب کچھ اردو ادب کے قاری کے لئے دل چسپ اور فکر انگیز ہے۔

میرے خیال میں محترمہ ادا جعفری صاحبہ اگر اشعار کا انتخاب فرماتے وقت مختلف عنوانات کے تحت اشعار لکھ دیا کریں۔ (مثلاً حمد، غزل، نظم، مدح، منقبت، نعت وغیرہ) تو کیا رہے گا؟ گوشۂ طلبہ میں ملک میں ہونے والی تعلیمی کانفرنس کے مقالات کو بالاقساط شائع کر دیا جائے تو یہ گوشہ مزید مفید اور معلومات افزا ہو سکتا ہے۔ نئے خزانے میں ابوسلمان شاہجہان پوری جس محنت اور جانفشانی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ قابلِ صد ستائش ہے۔

یہ انگریزی و سندھی ادب پر خاص عنایت خوب لیکن عربی فارسی ادب ان معلومات سے خالی تو نہیں جن کی تلاش ہے۔

"قومی زبان" کو اس خوب صورتی سے چلانے پر آپ کو مبارک باد، محترمہ ادا جعفری صاحبہ کے لئے نعرۂ تحسین اور کاظمی صاحب کے لئے ڈھیروں دعائیں۔ بابائے اردو کی روایات کو جاری رکھنے پر ادارہ کو دلی مبارک باد۔

والسلام —— مع الاحترام

محمد عبدالحق جامی۔ رحیم یار خان

محب گرامی سلام مسنون

ایک زمانے سے "قومی زبان" کے لیے کچھ نہیں بھیجا اور میری قومی زبان کو مجھ سے ایسی محبت ہے کہ ہر مہینے مجھے یاد کرتی ہے۔ اس یاد آوری کے لیے میں آپ کا سرتاپا سپاس گزار ہوں۔ رسالے کی تشکیل جدید نے کچھ اور مزہ دیا۔ معیار پہلے بھی خوب تھا اب خوب تر ہو گیا۔

عالی صاحب کی خدمت عالی میں سلام۔

نیاز کیش

ایس۔ مرتضیٰ اختر جعفری۔ پشاور

سنگھاسن بتیسی

مصنف :۔ فقیر ذکی

مرتبہ :۔ افسر صدیقی

صفحات :۔ ۹۴

قیمت :۔ دس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ، کراچی

نئے خزانے

ابوسلمان شاہجہان پوری

یہ اشاریہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

ادب ولسانیات

اردو ادب۔ تحقیق و تنقید و مسائل

دیگر زبانوں کا ادب

علمی، تعلیمی، لسانی اور دیگر ادارے

تاریخ و سیاست

تصوف سائنس اور فلسفہ

تعلیم

سیر و سیاحت

شخصیات

علامہ اقبال

اخگر سرحدی

پرتو روہیلہ

خالد محمود عارف

خلش کلکتوی

فارغ بخاری

ممتاز حسین

مولانا محمد شفیع اوکاڑوی

خواجہ قمرالدین سیالوی

ادبی شخصیات

تاریخی و سیاسی شخصیات

مذہبی شخصیات

صحافت

کتابیات اور کتب خانے

نوادر علمیہ

مذہبیات

اسلامی قانون و فقہ اور اس کے مسائل

سیرت نبویؐ

صحابہ کرامؓ

قرآنیات

مسائل و مباحث

اس اشاریے کی ترتیب میں مئی تا جولائی ۱۹۸۴ء کے رسائل اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے۔

ماہنامہ	اخبار اردو	اسلام آباد	جنوری تا جون	۱۹۸۴ء	ماہنامہ	فکر و نظر	اسلام آباد	مارچ تا مئی	۱۹۸۴ء
سہ ماہی	اردو	کراچی	اپریل	"	"	فیض الاسلام	راولپنڈی	مئی تا جولائی	"
ماہنامہ	اردو زبان	سرگودھا	مئی	"	"	قومی زبان	کراچی	مئی جون	"
"	اردو نامہ	لاہور	مئی تا جولائی	"	"	محدث	لاہور	اپریل تا جولائی	"
"	اظہار	کراچی	مارچ تا جون	"	"	المعارف	"	مئی جون	"
"	افکار	"	جولائی	"	"	میثاق	مئی "	مئی تا جولائی	"
"	انجمن	"	مئی	"	"	نئی قدریں	حیدرآباد	نمبر ۵، ۶	"
"	برہان	دہلی	مئی، جون	"	"	نیرنگ خیال	راولپنڈی	مئی، جون	"
"	البلاغ	کراچی	مئی تا جولائی	"	"	ہمدرد صحت	کراچی	اگست	"
"	پاک ڈائجسٹ	لاہور	مارچ	"	پندرہ روزہ	الارشاد جدید	"	اپریل، مئی	"
"	تحقیق	"	مارچ تا جون	"	"	تعمیر حیات	لکھنو	مئی جون	"
"	تدبیر	"	اپریل	"	"	تقاضے	لاہور	"	"
"	ترجمان الحدیث	"	مئی تا جولائی	"	"	خبرنامہ طب	"	مارچ تا مئی	"
"	ترجمان القرآن	"	" "	"	"	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	مئی تا جولائی	"
"	الجامعہ	جھنگ	مئی و جون	"	ہفت روزہ	الاسلام	لاہور	اپریل تا جولائی	"
"	الحق	اکوڑہ خٹک	مارچ تا جون	"	"	الاعتصام	"	"	"
"	الخیر	ملتان	مئی	"	"	الہام	بہاولپور	مئی تا جولائی	"
"	حکمت قرآن	لاہور	مئی تا جولائی	"	"	انصاف	راولپنڈی	"	"
"	راہنمائے صحت	فیصل آباد	مارچ	"	"	تکبیر	کراچی	"	"
"	سب رس	کراچی	"	"	"	چٹان	لاہور	"	"
"	شام و سحر	لاہور	اپریل تا جون	"	"	خدام الدین	"	"	"
دو ماہی	صحیفہ	"	اپریل جون	"	"	رضاکار	"	اپریل تا جولائی	"
ماہنامہ	صدائے اسلام	پشاور	اپریل	"	"	صدق جدید	لکھنو	اپریل مئی	"
سہ ماہی	صدف	جنوری	جنوری	"	"	کشمیر	راولپنڈی	اپریل تا جولائی	"
ماہنامہ	ضیائے حرم	لاہور	جون	"	"	لاہور	لاہور	مئی تا جولائی	"
"	طلوع اسلام	"	مئی تا جولائی	"	"	المنبر	فیصل آباد	اپریل	"
"	فاران	کراچی	مارچ مئی	"	"	ہماری زبان	دہلی	۷، جولائی	"

ادب ولسانیات

اردو، علمی، فنی اور لسانی مسائل

ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر	اردو میں اصلاح سازی	اخبار اردو	اسلام آباد	فروری	۸۴ء	ص ۳
اختر راہی	اردو ٹائپ کی کہانی	"	"	مارچ	"	ص ۱
انجم، کیپٹن ریاض احمد	اردو اور انگریزی حروف کا موازنہ	"	"	جون	"	ص ۴
اندرا گاندھی، مسز	قومی اتحاد اور اردو	ہماری زبان	دہلی	۱۵ جولائی		ص ۲
انعام الرحمٰن صدیقی	زبان کی اہمیت	اردو نامہ	لاہور	جون	"	ص ۷
"	"	"	"	جولائی	"	ص ۲۹
جیلانی کامران	قومی اور علاقائی زبانوں کا مسئلہ	اخبار اردو	اسلام آباد	جنوری	"	ص ۴
حسام الدین راشدی، پیر	اردو زبان کا اصل مولد — سندھ	اظہار	کراچی	مارچ	"	ص ۲،۳
حسن اختر	اردو میں لسانی مباحث کا آغاز	تخلیق	لاہور	ستمبر ۸۳،۸۴	"	ص ۱۵
صدیق طاہر	اردو، سرکاری زبان	اردو نامہ	"	مئی	"	ص ۱۹
طاہر مسعود	قومی زبان کا نفاذ اور بیوروکریسی (میجر آفتاب حسن سے گفتگو)	تکبیر	کراچی	۱۲ جولائی	"	ص ۱۲
عبدالرزاق	دفتری اردو کے قدیم نمونے	اردو نامہ	لاہور	مئی	"	ص ۱۲
"	"	"	"	جون	"	ص ۱۷
عبدالستار دلوی، ڈاکٹر	مہاراشٹر میں اردو	ہماری زبان	دہلی	۱۵ جولائی	"	ص ۱
عبداللہ، ڈاکٹر سید	مشکل اور آسان زبان کا مسئلہ	اخبار اردو	اسلام آباد	جنوری	"	ص ۱
عبدالمغنی، ڈاکٹر	زبان کا مسئلہ اور ڈاکٹر	ہماری زبان	دہلی	۱۵ جولائی	"	ص ۸
عقیل، ڈاکٹر معین الدین	فروغ لسانیات کی ضرورت	اردو نامہ	لاہور	مئی	"	ص ۸
محمد اسلم قریشی، ڈاکٹر	اصطلاحات ذرائع ابلاغ	اخبار اردو	اسلام آباد	مارچ	"	ص ۱۰
مظفر حسین ملک، ڈاکٹر	اردو اور علاقائی زبانیں (اصول ارتقاء کی روشنی میں)	"	"	اپریل	"	ص ۷
ناصر، ڈاکٹر نذیر احمد	اردو میں وضع اصطلاحات کا مسئلہ	"	"	جنوری	"	ص ۹
یاد، مشکور حسین	قومی زبان کا تنفس اور ہمارے تنفس کا مسئلہ	"	"	فروری	"	ص ۱

اردو ادب۔ تحقیق و تنقید و مسائل۔

ابن الحسن	قومی شعور اور ادیب	لاہور	لاہور	۱۲ جولائی	۸۴ء	ص	۱۳
احمد رفاعی، ڈاکٹر	ادیبوں کے مسائل	فاران	کراچی	مارچ	۸۴ء	ص	۲۹
انصار اللہ، محمد	خطوط ایران	اردو	”	اپریل	”	ص	۱۱۳
پروین عاطف	خوابوں کے جزیرے	تخلیق	لاہور	ستمبر ۸۳ء	”	ص	۸۱
جمیل زبیری	پاکستان میں جدید اردو افسانہ اور تنقید کے مسائل	اظہار	کراچی	مئی	”	ص	۸۷
حسین اختر	نظم آزاد کی تفہیم کا مسئلہ	صحیفہ	لاہور	اپریل	”	ص	۴۹
سعادت سعید	فسانہ آزاد۔ ایک تنقیدی تجزیہ	قومی زبان	کراچی	جون	”	ص	۱۹
سعید احمد عثمانی	زبان و لغت پر ایک نظر	”	”	مئی	”	ص	۲۱
شانتی رنجن، بھٹاچاریہ	بنگال میں اردو شاعری۔ انیسویں صدی کے آخر تک	اردو	”	اپریل	”	ص	۴۲
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	امین آباد اسکول سے جوبلی کالج تک	افکار	”	جولائی	”	ص	۱۷
عبدالحمید یزدانی، ڈاکٹر خواجہ	آئینہ داغ، ایک جائزہ	شام و سحر	لاہور	جون	”	ص	۵
عمر فاروق، ایس ایم	اردو	نیرنگ خیال	راولپنڈی	”	”	ص	۱۰
عمیرہ شاہ	برصغیر پاک و ہند میں سامان تحریر کی تیاری	المعارف	لاہور	مئی	”	ص	۲۵
غوث علی شاہ، جسٹس سید	اردو ادب پر سندھ کی ثقافت کے اثرات	اظہار	کراچی	”	”	ص	۸۱
قدرت نقوی، سید	دوہا	تخلیق	لاہور	نمبر ۵، ۶	”	ص	۷
گیان چند، ڈاکٹر	اردو میں تحقیق و تدوین (۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۰ء)	اردو	کراچی	اپریل	”	ص	۵
مظفر علی سید	ادب اور تاریخی شعور	نیرنگ خیال	راولپنڈی	مئی	”	ص	۲۲۱
منظر امام	اردو افسانے کے اسی سال	”	”	جون	”	ص	۳۰
منظر، منظر علی خان	جنریشن گیپ	اردو زبان	سرگودھا	مئی	”	ص	۲۱
نور محمد قادری، سید	شاعرۂ بزم خسروی	صحیفہ	لاہور	اپریل	”	ص	۶۸
—	خطوط نگاری کی نئی حیثیت	تعمیر حیات	لکھنؤ	۲۵ مئی	”	ص	۱۱

دیگر زبانوں کا ادب

انوار الحق، سید	پشتو ادب کا ثقافتی پس منظر	ندائے افغان	ملتان	یکم مئی	”	ص	۳

عابد، عابد شاہ	پشتو غزل	ندائے افغان	ملتان	یکم جون	۸۴ء	ص	۳
عبدالحق، ڈاکٹر	جدید اردو ادب میں مقالہ نگاری کا ارتقاء	برہان	دہلی	جولائی	"	ص	۴۵
عارف نوشاہی	فارسی میں علمی و فنی اصطلاحات پر کتب	اخبار اردو	اسلام آباد	مئی	"	ص	۶
رجب قاسمی	ابتدائی سندھی نثر کی تاریخ	تحقیق	لاہور	نمبر ۳۔۴	"	ص	۲۱
وقار احمد رضوی	عربی زبان اتحاد اسلامی اور فکر انسانی کی تاریخ کی حیثیت سے	مجلہ تاریخ و ثقافت پاکستان	اسلام آباد	جولائی	۸۱ء	ص	۱

علمی، تعلیمی، لسانی اور دیگر ادارے

انعام اللہ خان، ڈاکٹر	مؤتمر العالم الاسلامی	المنبر	فیصل آباد	۱۶ اپریل	۸۴ء	ص	۹
شمس تبریز خان	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام	تعمیر حیات	لکھنؤ	۱۰ جون	"	ص	۱۲
صلاح الدین یوسف	ادارۃ الدعوۃ السلفیہ	الاعتصام	لاہور	۲۵ مئی	"	ص	۱۱
عبدالغفور ایوان	مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین ڈاکٹر وحید قریشی (انٹرویو)	اخبار اردو	اسلام آباد	جون	"	ص	۹
عطش درانی	دیوان بھاسا دان پتا کا (ملائیشیا میں قومی زبان و ادب کا مرکزی ادارہ)	"	"	"	"	ص	۱
محمد ایوب کاشمیری	ندوۃ العلماء اپنے کردار کے آئینے میں	تعمیر حیات	لکھنؤ	۲۵ جون	"	ص	۱۱
نور محمد قادری	انجمن نعمانیہ لاہور	المعارف	لاہور	جون	"	ص	۴۳

تاریخ و سیاست

ابوالکلام قاسمی، مولانا	فرعون تحقیق و تاریخ کی روشنی میں	برہان	دہلی		"	ص	۴۹
"	"	"	"	جولائی	"	ص	۶
اختر کاشمیری و آصف بھاتی	سردار عبدالقیوم خان سے انٹرویو	چٹان	لاہور	۷ مئی	"	ص	۹
ارشد القادری	ایران میں سنی مسلمانوں کے بنیادی مسائل	الہام	بہاولپور	۳۰ اپریل	"	ص	۵
سعد گیلانی	وحدت علی کی دو حقیقتیں	ترجمان القرآن	لاہور	جولائی		ص	۱۸
آصف بھاتی، محمد	اندرا حکومت اور ریاست کشمیر کا تشخص (بیگم اختر سے انٹرویو)	چٹان	"	۹ جولائی	"	ص	۱۲
افضل خان، میجر امیر	قادیان سے اسرائیل تک قادیانی سازشیں	الحق	اکوڑہ خٹک	مئی	۸۴ء	ص	۹

افضل خان امیر مجبر	افواج پاکستان اور قادیانی سازشیں	الحق	اکوڑہ خٹک	مئی	۸۴ء	ص ۷
بزاز، پنڈت پریم ناتھ	انا سائیڈ کشمیر (۲) [۱]	کشمیر	راولپنڈی	۷؍اپریل	”	ص ۴
پرویز	اسلامی مملکت سے متعلق مختلف سوالات	طلوع اسلام	لاہور	جون	”	ص
جانباز مرزا	تحریک کشمیر اور احرار مزنگ سیاستدان سید	چٹان	”	۲۸؍مئی	”	ص ۶
	امیر حسین کے جواب میں (۱)					ص ۱۵
” ”	” ” ” ” ” (۲)	”	”	۱۱؍جون	”	ص ۱۵
” ”	” ” ” ” ” (۳)	”	”	۱۷؍جون	”	ص ۲۲
” ”	” ” ” ” ” (۴)	”	”	۳۰؍”	”	ص ۲۷
” ”	” ” ” ” ” (۵)	”	”	۹؍جولائی	”	ص ۲۷
” ”	” ” ” ” ” (۶)	”	”	۱۶؍”	”	ص ۲۹
عبداللہ، ڈاکٹر	میثاق مدینہ	تقاضے	”	۱۵؍مئی	”	ص ۱۵
خالد اسحاق	قومی یکجہتی کے مسائل	اظہار	کراچی	مئی	”	ص ۸۲
خلیل اللہ، پروفیسر محمد	جدوجہد آزادی اور قیام پاکستان	صدف	کراچی	جنوری	”	ص ۱۸
خلیلی، منیر احمد	سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد یوسف سے بات چیت	تکبیر	”	۲۵؍مئی	”	ص ۱۱
خورشید، عزیز الرحمٰن	فتح مکہ	خدام الدین	لاہور	۱۸؍”	”	ص ۱۴
ذکی الرحمٰن، مولانا	دوست انقلابی اسلامی افغانستان	محدث	”	جون	”	ص ۳۲
سلامی، عبدالسلام	خان عبدالولی خان سے بات چیت	تکبیر	کراچی	۱۱؍مئی	”	ص ۸
” ”	سابق کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ گواہی دیتے ہیں	”	”	یکم جون	”	ص ۱۰
سلیم احمد	اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ	البلاغ	”	جولائی	”	ص ۳۲
سمیع الحق	قادیانی اور صدارتی آرڈی ننس	الحق	اکوڑہ خٹک	اپریل	”	ص ۲
شاہد محمد اجمل	فرعون موسیٰ کی لاش	لاہور	لاہور	۲۰؍جولائی	”	ص ۱۱

---

[۱] پنڈت بزاز کی کتاب کا ترجمہ از عبدالحمید نظامی، ۱۰؍جولائی تک اس کی ۱۵ قسطیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

شفیق حسن مرزا	جموں و کشمیر ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۷ء تک (لاہور کے اخبارات کے آئینے میں)[1]	کشمیر	راولپنڈی	۱۷ اپریل	۸۴ء	ص ۴
شمس الحسن، نواب	قائداعظم محمد علی جناح اور چند یادیں	صدف	کراچی	جنوری	۸۴ء	ص ۲۲
طاہر مسعود	مولانا ظفر احمد انصاری سے انٹرویو	تکبیر	”	۱۲ اپریل	”	ص ۸
” ”	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے تکبیر کا انٹرویو	”	”	۱۰ جون	”	ص ۱۰
” ”	بھارت کے ممتاز اسکالر اور مذہبی رہنما مولانا الاسعد صابری سے چند باتیں	”	”	۲۹ ”	”	ص ۱۲
طفیل محمد میاں	تحریک اسلامی اور موجودہ صورتحال	ترجمان القرآن	لاہور	مئی	”	ص ۴۳
ظفر حسین	اسلامی جذبۂ جہاد بمقابلہ حب الوطنی	نیرنگ خیال	راولپنڈی	”	”	ص ۲۴
عبدالصمد درانی	آزاد کشمیر کا قیام پس منظر	کشمیر	”	۲۴ اپریل	”	ص ۹
عبدالرحمٰن فاروقی	کتبۃ اللہ	فلاح الدین	لاہور	۳۰ جولائی	”	ص ۱۹
قمر، قمرالحق	بادشاہی مسجد کی کہانی ۔ مولانا سید عبدالقادر آزاد کی زبانی	چٹان	”	۲۰ جون	”	ص ۱۵
قمر احمد عثمانی	اسلام میں گروہی سیاست اور جماعت سازی کا تصور	فیض الاسلام	راولپنڈی	جون	”	ص ۳۲
محمد اسلم، پروفیسر	شریف التواریخ	برہان	دہلی	”	”	ص ۲۷
” ”	”	”	”	جولائی	”	ص ۲۲
محمد تقی عثمانی	قادیانیت اور نیا آرڈی ننس	البلاغ	کراچی	مئی	”	ص ۳
محمد ظہیر	مغل کون تھے اور انھوں نے ہند پر کس طرح حکومت کی	اظہار	”	”	”	ص ۵۱
محمد ظہیر	مغل حرم کا شہنشاہوں پر اثر	الہام	بہاولپور	۷ جون	”	ص ۴
محمد یونس، قاری	جزائر مالدیپ پر ایک نظر	فکر و نظر	اسلام آباد	مئی	”	ص ۴۷
محی الدین	سوویت روس اور مسلمان	تعمیر حیات	لکھنؤ	۱۷ مئی	”	ص ۵
مصطفیٰ علی بریلوی، سید	سری رنگا پٹم سے لال قلعہ تک	اظہار	کراچی	مئی	”	ص ۷۶
نذیر احمد کاشمیری، صوفی	ملوکیت، جمہوریت اور خلافت علی منہاج النبوۃ	الاستقامۃ	لاہور	۱۵ جون	”	ص ۴

---

[1] پیش نظر ۲۲ جون تک اس سلسلے کی ۹۳ قسطیں شایع ہو چکی ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

نعیم آسی	مولانا خان محمد سے ایک اہم انٹرویو	چٹان	لاہور	۷ مئی	۸۴ء	ص ۷
نیاز، ڈاکٹر اسلام الدین	ان کہی، دوستان کشمیر (۲۱)	شام و سحر	"	اپریل	"	ص ۶۲
" " "	" " (۲۲)	"	"	جون	"	ص ۳۹
وسعت اللہ خان	مقبوضہ کشمیر کے تازہ حالات	تکبیر	کراچی	۱۳ جولائی	"	ص ۸
یونس تحلش	پیر نصیر الدین گولڑوی سے گفتگو	چٹان	لاہور	۳۱ مئی	"	ص ۲۱

تصوف سائنس اور فلسفہ

الطاف الرحمن بنوی، مولانا	تصوف کی حقیقت	حکمت قرآن	لاہور	جولائی	"	ص ۱۹
ایاز، محمد اشفاق	ایٹمی توانائی کا طبی استعمال	راہنمائے صحت	فیصل آباد	اپریل	"	ص ۲۵
کاظم نقوی، سید	فکر انسانی کی نئی تشکیل	صدق جدید	لکھنؤ	۱۱ مئی	"	ص ۷
" " "	" " " " (۲)	"	"	۱۸ "	"	ص ۶
منیر احمد خان	جوہری توانائی	الہام	جھنگ	جون	"	ص ۴۸

تعلیم

ابو الحسن علی ندوی، مولانا سید	احمدیہ سلفیہ کے جلسہ دستار بندی سے خطاب	تعمیر حیات	لکھنؤ	۲۵ مئی	"	ص ۴
طاہر مسعود	جامعہ کراچی کے وائس چانسلر ڈاکٹر جمیل جالبی سے بات چیت	تکبیر	کراچی	۲۳ جون	"	ص ۸
عبد القیوم حقانی، مولانا	نصاب مدارس عربیہ کی تشکیل جدید کا مسئلہ	الحق	اکوڑہ خٹک	مارچ	"	ص ۵۱
عبد اللہ، ڈاکٹر سید	قانون کی تعلیم اور قومی زبان	اردو نامہ	لاہور	جون	"	ص ۱۲
وقار احمد رضوی	مسلمان اور جدید علوم	فکر و نظر	اسلام آباد	مئی	۸۳ء	ص ۳۳

سیر و سیاحت

خلیل حامدی	حامدی صاحب کے ترکی سفر کی داستان	ترجمان القرآن	لاہور	مئی	۸۴ء	ص ۳۸
"	" " " "	"	"	جون	"	ص
"	" " " "	"	"	جولائی	"	ص ۲۷
محمد زماں	گردش میں پاؤں	تخلیق	"	نمبر ۲، ۴	"	ص ۷۳
محمد اسلم، پروفیسر	دہلی کا تازہ سفرنامہ	الحق	اکوڑہ خٹک	مئی	"	ص ۴۸

محمد اسلم پرویز	دہلی کا تازہ سفرنامہ	الحق	اکوڑہ خٹک	جون	۸۴ء	ص ۴۲

شخصیات

علامہ اقبال

ابوسلمان شاہ جہان پوری	حضرت علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد نقادوں کی نظر میں	چٹان	لاہور	۱۱ جون	،،	ص ۲۴
اسرار احمد سہاوری	آہنگ اقبال کی خصوصیات	فاران	کراچی	اپریل	،،	ص ۱۹
آزاد، جگن ناتھ	تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں	اردو زبان	سرگودھا	مئی	،،	ص ۱۵
پرویز	خلق خدا کی گھات میں (نقیہ و میر و پیر) بہ	طلوع اسلام	لاہور	،،	،،	ص ۲۳
	تقریب یوم اقبال ۱۹۸۴ء	،،	،،	جون	،،	ص ۲۵
چار مرگ دریاد اقبال	چار مرگ دریاد اقبال					
سرخوش، عزیز باشم، آغا	علامہ اقبال، ہز ہائینس آغا خان اور راجہ صاحب محمود آباد	اظہار	کراچی	مئی	،،	ص ۳۶
شاہین، رحیم بخش	علامہ اقبال اور اردو زبان	اخبار اردو	اسلام آباد	اپریل	،،	ص ۱
صغیر احمد رضوی، سید	مسجد قرطبہ	نئی	حیدرآباد	نمبر ۵،۶	،،	ص ۸۵
عتیقی، عتیق احمد	اقبال اور عشق رسول	فاران	کراچی	اپریل	،،	ص ۱۱
محمد ریاض، ڈاکٹر	اقبال اور عالم اسلام	فکر و نظر	اسلام آباد	،،	،،	ص ۷
،،	رومی اور اقبال	اظہار	کراچی	مئی	،،	ص ۲۲

اخگر سرحدی

حافظ لدھیانوی	اخگر سرحدی	نوائے افغان	ملتان	۱۶ مئی	،،	ص ۳
خاطر غزنوی	لالہ اخگر	قومی زبان	کراچی	مئی	،،	ص ۹
عبداللہ، ڈاکٹر سید	اخگر سرحدی۔ ایک تاثر	،،	،،	،،	،،	ص ۷

پرتو روہیلہ

ثاقب رحیم الدین خان	پرتو روہیلہ۔ اپنے فن کے آئینے میں	نیرنگ خیال	راولپنڈی	جون	،،	ص ۶۱

جہانگیر خان	گیان دھیان کا جوگی (پرتو روہیلہ)	نیرنگِ خیال	راولپنڈی	مئی	۸۴ء	ص ۹۶
سلطان رشک	ایک تاثر	"	"	"	"	ص ۱۰۰

خالد محمود عارف

ادا جعفری	شہرِ ممکنات کا شاعر	"	"	"	"	ص ۱۴۲
وحید قریشی، ڈاکٹر	گردِ سفر کا شاعر	"	"	"	"	ص ۱۴۸
وزیر آغا، ڈاکٹر	ہو حلقۂ یاراں ۔۔۔	"	"	"	"	ص ۱۴۹

خلش کلکتوی

جلیس اطہر رشید	میرے ابو	پاک ڈائجسٹ[1]	لاہور	مارچ	"	ص ۱۰۷
رضی ناطقی	میرے بڑے بھائی	"	"	"	"	ص ۱۰۴
رفیع کلکتوی	میرے خیال میں	"	"	"	"	ص ۱۵۷
شاعر صدیقی	ایک انسان دوست شاعر	"	"	"	"	ص ۹۹
ظہور حیدر زیدی سیار	محبت آدمی مبارک ہو	"	"	"	"	ص ۹۷
فضل من اللہ	خلش کلکتوی (انٹرویو)	"	"	"	"	ص ۸۱
وارث سرہندی	سچائیاں ہی سچائیاں	"	"	"	"	ص ۷۵
وفا راشدی، ڈاکٹر	ذکرِ یار چلے	"	"	"	"	ص ۹۱

فارغ بخاری

احمد ندیم قاسمی	خوشبو کا سفر کا مصنف	افکار	کراچی	جولائی	"	ص ۲۶
صہبا لکھنوی	فارغ بخاری، مختصر حالات	"	"	"	"	ص ۲۵
محمد ظاہر صدیقی	حیات و کائنات کا شاعر۔ فارغ	"	"	"	"	ص ۲۸

ممتاز حسن

ابن انشاء	یاد یارِ مہرباں آید ہمی	سب رس	"	مارچ	"	ص ۱۶۷

---

[1] پاک ڈائجسٹ کا یہ شمارہ خلش کلکتوی کی شخصیت ان کی شاعری فن اور دیگر خصائص کے تذکرے کے لئے وقف ہے۔ مجموعہ مضامین کے علاوہ متعدد اہل علم و ادب کے منظوم و منثور تاثرات اور خلش کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔

Regd. S. No. 1138 Phone : 217137

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوزہ عمارت کا نقشہ

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر :- شبیر علی کاظمی- کلیم الحسن نقوی کے زیر اہتمام انجمن پریس کراچی میں چھپ کر
انجمن ترقی اردو (پاکستان) - باباۓ اردو روڈ - کراچی سے شائع ھوا -